ماہنامہ

موازنۂ مذاہب

ISSN: 20491131
ایڈیٹر: محفوظ الرحمان

ستمبر 2025ء | تبوک 1404 ھجری شمسی | ربیع الاوّل 1447 ھجری قمری | جلد 14 نمبر 09

اس شمارہ میں

https://www.alislam.org/periodical/muwazna-e-madhahib

ماہنامہ
مواز نۂ مذاہب

جلد14 شمارہ09 تبوک 1404 ہجری شمسی، ربیع الاوّل 1447 ہجری قمری بمطابق ستمبر 2025ء

فہرست مضامین

پبلشرز : Additional Wakalat Tasneef
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, GU9 9PS UK
office@tasneef.co.uk

اداریہ:

"کبھی ہو کر وہ پانی اُن پہ اِک طوفان لاتی ہے"

مدیر کے قلم سے

الٰہی عذابوں کی ایک بنیادی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ لوگ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے مامور سے جب استہزاء اور شرارت میں بڑھ جاتے ہیں تو پھر خدا تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے تمام نبی اِس بات پر متفق ہیں کہ عادت اللہ ہمیشہ سے اِس طرح پر جاری ہے کہ جب دنیا ہر ایک قسم کے گناہ کرتی ہے اور بہت سے گناہ ان کے جمع ہو جاتے ہیں تب اس زمانہ میں خدا اپنی طرف سے کسی کو مبعوث فرماتا ہے اور کوئی حصہ دنیا کا اس کی تکذیب کرتا ہے تب اُس کا مبعوث ہونا دوسرے شریر لوگوں کی سزا دینے کے لئے بھی جو پہلے مجرم ہو چکے ہیں ایک محرک ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے گذشتہ گناہوں کی سزا پاتا ہے اُس کے لئے اِس بات کا علم ضروری نہیں کہ اس زمانہ میں خدا کی طرف سے کوئی نبی یا رسول بھی موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: 16) پس اس سے زیادہ میرا مطلب نہ تھا کہ ان زلزلوں کا موجب میری تکذیب ہو سکتی ہے۔ یہی قدیم سے سُنت اللہ ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سوسان فرانسسکو وغیرہ مقامات کے رہنے والے جو زلزلہ اور دوسری آفات سے ہلاک ہو گئے ہیں اگرچہ اصل سبب اُن پر عذاب نازل ہونے کا اُن کے گذشتہ گناہ تھے مگر یہ زلزلے اُن کو ہلاک کرنے والے میری سچائی کا ایک نشان تھے کیونکہ قدیم سُنت اللہ کے موافق شریر لوگ کسی رسول کے آنے کے وقت ہلاک کئے جاتے ہیں اور نیز اِس وجہ سے کہ میں نے براہین احمدیہ اور بہت سی اپنی کتابوں میں یہ خبر دی تھی کہ میرے زمانہ میں دنیا میں بہت سے غیر معمولی زلزلے آئیں گے اور دوسری آفات بھی آئیں گی اور ایک دنیا اُن سے ہلاک ہو جائے گی۔ پس اِس میں کیا شک ہے کہ میری پیشگوئیوں کے بعد دُنیا میں زلزلوں اور دوسری آفات کا سلسلہ شروع ہو جانا میری سچائی کے لئے ایک نشان ہے۔ یاد رہے کہ خدا کے رسول کی خواہ کسی حصہ زمین میں تکذیب ہو مگر اس تکذیب کے وقت دوسرے مجرم بھی پکڑے جاتے ہیں جو اور ملکوں کے رہنے والے ہیں جن کو اس رسول کی خبر بھی نہیں۔ **جیسا کہ نوح کے وقت میں ہوا کہ ایک قوم کی تکذیب سے ایک دنیا پر عذاب آیا بلکہ پرند چرند بھی اس عذاب سے باہر نہ رہے۔**

غرض عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جب کسی صادق کی حد سے زیادہ تکذیب کی جائے یا اُس کو ستایا جائے تو دنیا میں طرح طرح کی بلائیں آتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی تمام کتابیں یہی بیان فرماتی ہیں اور قرآن شریف یہی فرماتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی تکذیب کی وجہ سے مصر کے ملک پر طرح طرح کی آفات نازل ہوئیں۔ جوئیں برسیں، مینڈکیں برسیں، خون برسا اور عام قحط پڑا۔ حالانکہ مُلک مصر کے دور دور کے باشندوں کو حضرت موسیٰ کی خبر بھی نہ تھی اور نہ اُن کا اس میں کچھ گناہ تھا اور نہ صرف یہ بلکہ تمام مصریوں کے پلوٹھے بچے مارے گئے اور فرعون ایک مدت تک ان آفت سے محفوظ تھا اور جو محض بے خبر تھے وہ پہلے مارے گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب سے قتل کرنا چاہا تھا اُن کا تو بال بیکا بھی نہ ہوا اور وہ آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن چالیس برس بعد جب وہ صدی گذرنے پر تھی تو طیطوس رومی کے ہاتھ سے ہزاروں یہودی قتل کئے گئے اور طاعون بھی پڑی۔ اور قرآن شریف سے ثابت ہے کہ یہ عذاب محض حضرت عیسیٰ کی وجہ سے تھا۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سات برس کا قحط پڑا اور اکثر اس قحط میں غریب ہی مارے گئے اور بڑے بڑے سردار فتنہ انگیز جو دُکھ دینے والے تھے مُدت تک عذاب سے بچے رہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سُنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی خدا کی طرف سے آتا ہے اور اُس کی تکذیب کی جاتی ہے تو طرح طرح کی آفتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں جن میں اکثر ایسے لوگ پکڑے جاتے ہیں جن کا اس تکذیب سے کچھ تعلق نہیں پھر رفتہ رفتہ ائمۃ الکُفر پکڑے جاتے ہیں اور سب سے آخر بڑے شریروں کا وقت آتا ہے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے: اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا۔(الرعد:42) یعنی ہم آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتے جاتے ہیں۔ اِس میرے بیان میں اُن بعض نادانوں کے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو کہتے ہیں کہ تکفیر تو مولویوں نے کی تھی اور غریب آدمی طاعون سے مارے گئے۔ اور کانگڑہ اور بھاگسو کے پہاڑ کے صدہا آدمی زلزلہ سے ہلاک ہو گئے۔ اُن کا کیا قصور تھا۔ اُنہوں نے کونسی تکذیب کی تھی۔ سو یاد رہے کہ جب خدا کے کسی مُرسل کی تکذیب کی جاتی ہے خواہ وہ تکذیب کوئی خاص قوم کرے یا کسی خاص حصہ زمین میں ہو مگر خدا تعالیٰ کی غیرت عام عذاب نازل کرتی ہے اور آسمان سے عام طور پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصل شریر پیچھے سے پکڑے جاتے ہیں جو اصل مبدء فساد ہوتے ہیں جیسا کہ اُن قہری نشانوں سے جو حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے دکھلائے۔ فرعون کا کچھ نقصان نہ ہوا صرف غریب مارے گئے لیکن آخر کار خدا نے فرعون کو مع اُس کے لشکر کے غرق کیا۔ یہ سُنّت اللہ ہے جس سے کوئی واقف کار انکار نہیں کر سکتا۔“ (”حقیقۃ الوحی“ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 164 تا 167)

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ فرمایا:

”یاد رہے کہ خدا نے مجھے عام طور پر زلزلوں کی خبر دی ہے پس یقیناً سمجھو کہ جیسا کہ پیشگوئی کے مطابق امریکہ میں زلزلے آئے ایسا ہی یورپ میں بھی آئے اور نیز ایشیا کے مختلف مقامات میں آئیں گے اور بعض اُن میں قیامت کا نمونہ ہوں گے اور اس قدر موت ہوگی کہ خون کی نہریں چلیں گی۔ اس موت سے پرند چرند بھی باہر نہیں ہوں گے اور زمین پر اس قدر سخت تباہی آئے گی کہ اس روز سے کہ انسان پیدا ہوا ایسی تباہی کبھی نہیں آئی ہوگی اور اکثر مقامات زیر و زبر ہو جائیں گے کہ گویا اُن میں کبھی آبادی نہ تھی اور **اس کے ساتھ اور بھی آفات زمین اور آسمان میں ہولناک صورت میں پیدا ہوں گی یہاں تک کہ ہر ایک عقلمند کی نظر میں وہ باتیں غیر معمولی ہو جائیں گی** اور ہیئت اور فلسفہ کی کتابوں کے کسی صفحہ میں اُن کا پتہ نہیں ملے گا تب انسانوں میں اضطراب پیدا ہوگا کہ یہ کیا ہونے والا ہے۔ اور بہتیرے نجات پائیں گے اور بہتیرے ہلاک ہو جائیں گے۔ وہ دن نزدیک ہیں بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ دروازے پر ہیں کہ دنیا ایک قیامت کا نظارہ دیکھے گی اور نہ صرف زلزلے بلکہ اور بھی ڈرانے والی آفتیں ظاہر ہوں گی کچھ آسمان سے اور کچھ زمین سے یہ اس لئے کہ نوع انسان نے اپنے خدا کی پرستش چھوڑ دی ہے اور تمام دل اور تمام ہمت اور تمام خیالات سے دنیا پر ہی گر گئے ہیں اگر میں نہ آیا ہوتا تو اِن بلاؤں میں کچھ تاخیر ہو جاتی پر میرے آنے کے ساتھ خدا کے غضب کے وہ مخفی ارادے جو ایک بڑی مدت سے مخفی تھے ظاہر ہو گئے جیسا کہ خدا نے فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: 16) اور توبہ کرنے والے امان پائیں گے اور وہ جو بلا سے پہلے ڈرتے ہیں اُن پر رحم کیا جائے گا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم اِن زلزلوں سے امن میں رہو گے یا تم اپنی تدبیروں سے اپنے تئیں بچا سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ انسانی کاموں کا اُس دن خاتمہ ہوگا یہ مت خیال کرو کہ امریکہ وغیرہ میں سخت زلزلے آئے اور تمہارا ملک اُن سے محفوظ ہے میں تو دیکھتا ہوں کہ شاید اُن سے زیادہ مصیبت کا مُنہ دیکھو گے۔ اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں۔ اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں۔ وہ واحد یگانہ ایک مدت تک خاموش رہا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے مکروہ کام کئے گئے اور وہ چپ رہا مگر اب وہ ہیبت کے ساتھ اپنا چہرہ دکھلائے گا جس کے کان سُننے کے ہوں سُنے کہ وہ وقت دور نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ خدا کی امان کے نیچے سب کو جمع کروں پر ضرور تھا کہ تقدیر کے نوشتے پورے ہوتے۔ **میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس ملک کی نوبت بھی قریب آتی جاتی ہے نوح کا زمانہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا اور لوط کی زمین کا واقعہ تم بچشم خود دیکھ لو گے۔** مگر خدا غضب میں دھیما ہے توبہ کرو تا تم پر رحم کیا جائے جو خدا کو چھوڑتا ہے وہ ایک کیڑا ہے نہ کہ آدمی اور جو اُس سے نہیں ڈرتا وہ مُردہ ہے نہ کہ زندہ۔“ (”حقیقۃ الوحی“ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 269,268)

ارشاد باری تعالیٰ

قرآن انسانوں کے لئے ایک عظیم ہدایت

اَلْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ (البقرۃ: 186)

ترجمہ: ”قرآن انسانوں کے لئے ایک عظیم ہدایت (کے طور پر اُتارا گیا) اور ایسے کھلے نشانات کے طور پر جن میں ہدایت کی تفصیل اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے امور ہیں۔“

(ترجمہ از قرآن مجید حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ)

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”قرآن میں تین صفتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ جو علوم دین لوگوں کو معلوم نہیں رہے تھے ان کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔ دوسرے جن علوم میں پہلے کچھ اجمال چلا آتا تھا۔ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ تیسرے جن امور میں اختلاف اور تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں قول فیصل بیان کر کے حق اور باطل میں فرق ظاہر کرتا ہے۔“

(”براہین احمدیہ“ روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 225 حاشیہ)

اللہ کی کتاب ہی حبل اللہ ہے

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم

زَیْدِ بْنِ اَرْقَم ... قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فِيْنَا خَطِيْبًا بِمَاءٍ يُدْعَى خُمًّا، بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ، فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ۔ ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ، اَلَا اَيُّهَا النَّاسُ، فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ يُوْشِكُ اَنْ يَاْتِيَ رَسُوْلُ رَبِّيْ فَاُجِيْبَ، وَاَنَا تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ: اَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ، فِيْهِ الْهُدٰى وَالنُّوْرُ، فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ۔ فَحَثَّ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِيْهِ۔ ثُمَّ قَالَ: وَاَهْلُ بَيْتِيْ، اُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ اَهْلِ بَيْتِيْ۔ ... كِتَابُ اللّٰهِ... هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ، مَنِ اتَّبَعَهٗ كَانَ عَلَى الْهُدٰى، وَمَنْ تَرَكَهٗ كَانَ عَلٰى ضَلَالَةٍ۔

(”صحیح مسلم“ کتاب فضائل الصحابۃ رضی اللہ عنہ باب من فضائل علی بن ابو طالب حدیث: 2408)

زید ابن ارقم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیر خُم پر ہمارے درمیان خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور وعظ ونصیحت کی اور پھر فرمایا: امابعد، اے لوگو! غور سے سنو، میں ایک بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا پیامبر (مَلک الموت) میرے پاس آئے اور میں اُسے لبیک کہوں۔ اور میں تم میں دو نہایت گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ان میں سے پہلی کتاب اللہ (قرآن) ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس تم اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور اس کی تعلیمات پر عمل کرو۔ چنانچہ آپ نے کتاب اللہ کے لئے تحریص وترغیب دلائی۔ پھر فرمایا: اور (دوسرے) میرے اہل بیت ہیں۔ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔ اور (یاد رکھو) کہ اللہ کی کتاب ہی حبل اللہ ہے۔ جس نے اس کی پیروی کی تو وہ ہدایت پر ہے اور جس نے اسے چھوڑا تو وہ گمراہی پر ہے۔ (ترجمہ از مترجم ”حمامۃ البشریٰ“ اردو صفحہ 188,187 نظارت اشاعت ربوہ)

امام الکلام

قرآن شریف کے اتباع سے برکات الٰہی

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی بانئ جماعت احمدیہ مسیح موعود و مہدئ معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”لاکھوں مقدسوں کا یہ تجربہ ہے کہ قرآن شریف کے اتباع سے برکات الٰہی دل پر نازل ہوتی ہیں اور ایک عجیب پیوند مولیٰ کریم سے ہو جاتا ہے خدائے تعالیٰ کے انوار اور الہام ان کے دلوں پر اترتے ہیں اور معارف اور نکات ان کے مونہہ سے نکلتے ہی ایک قوی توکل ان کو عطا ہوتی ہے اور ایک محکم یقین ان کو دیا جاتا ہے اور ایک لذیذ محبت الٰہی جو لذّت وصال سے پرورش یاب ہے ان کے دلوں میں رکھی جاتی ہے اگر ان کے وجودوں کو ہاون مصائب میں پیسا جائے اور سخت شکنجوں میں دے کر نچوڑا جائے تو ان کا عرق بجز حُبِ الٰہی کے اور کچھ نہیں۔ دنیا ان سے ناواقف اور وہ دنیا سے دور تر و بلند تر ہیں۔

خدا کے معاملات ان سے خارق عادت ہیں انہیں پر ثابت ہوا ہے کہ خدا ہے۔ انہیں پر کھلا ہے کہ ایک ہے جب وہ دعا کرتے ہیں تو وہ ان کی سنتا ہے۔ جب وہ پکارتے ہیں تو وہ انہیں جواب دیتا ہے جب وہ پناہ چاہتے ہیں تو وہ ان کی طرف دوڑتا ہے وہ باپوں سے زیادہ ان سے پیار کرتا ہے اور ان کی در و دیوار پر برکتوں کی بارش برساتا ہے پس وہ اس کی ظاہری و باطنی و روحانی و جسمانی تائیدوں سے شناخت کئے جاتے ہیں اور وہ ہر یک میدان میں ان کی مدد کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے اور وہ ان کا ہے۔ یہ باتیں بلا ثبوت نہیں۔“

(”سرمہ چشم آریہ“ روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 79 حاشیہ)

کلام الامام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ سے عشق

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

”12 ربیع الاوّل کا دن وہ دن ہے جب دنیا میں وہ نور آیا جس کو اللہ تعالیٰ نے سراجِ منیر کہا۔ جس نے تمام دنیا کو روحانی روشنی عطا کرنی تھی اور کی۔ جس نے خدا تعالیٰ کی حکومت دنیا میں قائم کرنی تھی اور کی۔ جس نے برسوں کے مُردوں کو روحانی زندگی دینی تھی اور دی۔ جس نے دنیا کو امن اور سلامتی عطا کرنی تھی اور عطا کی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ (الانبیاء: 108) اور ہم نے تجھے دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ جو صرف انسانوں کے لئے نہیں بلکہ چرند پرند سب کے لئے رحمت ہے۔ جو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی رحمت تھا اور ہے۔ اور جس کی تعلیم تا قیامت ہر ایک کے لئے رحمت ہے۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماننے والوں کو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول میں تمہارے لئے اُسوۂ حسنہ ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے کہ لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَ الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا (الاحزاب: 22) کہ یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول میں نیک نمونہ ہے ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ پس اس اُسوۂ حسنہ پر چلنے کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ . . .

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے توحید کے قیام کے بھی نمونے قائم کئے۔ عبادتوں کے بھی نمونے قائم کئے۔ اعلیٰ اخلاق کے بھی نمونے قائم کئے اور حقوق العباد کے بھی نمونے قائم فرمائے۔ . . .

اللہ تعالیٰ سے جو آپؐ کو محبت تھی اسے بیان فرماتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ذات کے عاشقِ زار اور دیوانہ ہوئے اور پھر وہ پایا جو دنیا میں کبھی کسی کو نہیں ملا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ سے اس قدر محبت تھی کہ عام لوگ بھی کہا کرتے تھے کہ عَشِقَ مُحَمَّدٌ عَلٰى رَبِّهٖ۔ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب پر عاشق ہو گیا (ہے)۔ (”ملفوظات“ حضرت اقدس مسیح موعودؑ جلد 6 صفحہ 6 ایڈیشن 2022ء)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کے بارے میں بیان فرماتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام مزید فرماتے ہیں کہ: ”جب یہ آیتیں اتریں کہ مشرکین رِجس ہیں۔ پلید ہیں۔ شَرُّ الْبَرِیَّہ ہیں۔ سُفَہَاء ہیں اور ذُرّیتِ شیطان ہیں اور ان کے معبود وَقُودُ النّار اور حَصَبُ جہنم ہیں۔ تو ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر کہا کہ اے میرے بھتیجے اب تیری دشنام دہی سے قوم سخت مشتعل ہو گئی ہے اور قریب ہے کہ تجھ کو ہلاک کریں اور ساتھ ہی مجھ کو بھی۔ تُو نے ان کے عقلمندوں کو سَفِیہ قرار دیا اور ان کے بزرگوں کو شرّ البریّہ کہا اور ان کے قابلِ تعظیم معبودوں کا نام ھیزمِ جہنم اور وَقُوْدُ النّار رکھا اور عام طور پر ان سب کو رِجس اور ذریّتِ شیطان اور پلید ٹھہرایا۔ مَیں تجھے خیر خواہی کی راہ سے کہتا ہوں کہ اپنی زبان کو تھام اور دشنام دہی سے باز آجا ورنہ مَیں قوم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔“ (یہ آپ کے چچا نے آپ کو کہا) حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کہا کہ اے چچا! یہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ اظہارِ واقعہ ہے اور نفس الامر کا عین محل پر بیان ہے اور یہی تو کام ہے جس کے لئے مَیں بھیجا گیا ہوں۔ اگر اس سے مجھے مرنا درپیش ہے تو مَیں بخوشی اپنے لئے اس موت کو قبول کرتا ہوں۔ میری زندگی اسی راہ میں وقف ہے۔ مَیں موت کے ڈر سے اظہارِ حق سے رک نہیں سکتا۔ اور اے چچا اگر تجھے اپنی کمزوری اور اپنی تکلیف کا خیال ہے تو تُو مجھے پناہ میں رکھنے سے دستبردار ہو جا۔ بخدا مجھے تیری کچھ بھی حاجت نہیں۔ مَیں احکام الٰہی کے پہنچانے سے کبھی نہیں رکوں گا۔ مجھے اپنے مولیٰ کے احکام جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ بخدا اگر مَیں اس راہ میں مارا جاؤں تو چاہتا ہوں کہ پھر بار بار زندہ ہو کر ہمیشہ اسی راہ میں مرتا رہوں۔ یہ خوف کی جگہ نہیں بلکہ مجھے اس میں بے انتہا لذّت ہے کہ اس کی راہ میں دکھ اٹھاؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر کر رہے تھے اور چہرہ پر سچائی اور نورانیت سے بھری ہوئی رقّت نمایاں ہو رہی تھی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر ختم کر چکے تو حق کی روشنی دیکھ کر بے اختیار ابوطالب کے آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ مَیں تیری اس اعلیٰ حالت سے بے خبر تھا۔ تُو اور ہی رنگ میں اور اَور ہی شان میں ہے۔ جا اپنے کام میں لگا رہ۔ جب تک مَیں زندہ ہوں جہاں تک میری طاقت ہے مَیں تیرا ساتھ دوں گا۔“ (”ازالہ اوہام“ روحانی خزائن جلد 3 صفحہ 111,110)

آج ہم احمدیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کو ماننے کی وجہ سے یہ کافر ہیں۔ یہ واقعہ جو مَیں نے ابھی بیان کیا یہ ہم تاریخ میں پڑھتے اور سنتے ہیں لیکن جس بے اختیاری اور دلی کیفیت سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو بیان فرمایا ہے اس سے آپؑ کے عشقِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اس توسّط سے پھر خدا تعالیٰ سے عشق کے راستے بھی نظر آتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دکھائے۔

پھر عشقِ محمد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اس پہلو کے بارے میں مزید بیان فرماتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''پس مَیں ہمیشہ تعجب کی نگہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ہزار ہزار درود اور سلام اس پر)۔ یہ کس عالی مرتبہ کا نبی ہے۔ اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔ افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے اس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔ وہ توحید جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔ اس نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبت کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی۔'' (یہ دو چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت اور بنی نوع کی ہمدردی میں اپنے آپ کو فنا کر لینا۔) ''اِس لئے خدا نے جو اس کے دل کے راز کا واقف تھا اس کو تمام انبیاء اور تمام اوّلین و آخرین پر فضیلت بخشی اور اس کی مرادیں اس کی زندگی میں اس کو دیں۔ وہی ہے جو سرچشمہ ہر ایک فیض کا ہے اور وہ شخص جو بغیر اقرار افاضہ اس کے کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے وہ انسان نہیں ہے بلکہ ذریّتِ شیطان ہے کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کنجی اُس کو دی گئی ہے اور ہر ایک معرفت کا خزانہ اُس کو عطا کیا گیا ہے۔ جو اس کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافرِ نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ توحید حقیقی ہم نے اِسی نبی کے ذریعہ سے پائی اور زندہ خدا کی شناخت ہمیں اِسی کامل نبی کے ذریعہ سے اور اس کے نور سے ملی ہے اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی جس سے ہم اس کا چہرہ دیکھتے ہیں اِسی بزرگ نبی کے ذریعہ سے ہمیں میسر آیا ہے۔ اس آفتاب ہدایت کی شعاع دھوپ کی طرح ہم پر پڑتی ہے اور اسی وقت تک ہم منوّر رہ سکتے ہیں جب تک کہ ہم اس کے مقابل پر کھڑے ہیں۔'' (''حقیقۃ الوحی'' روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 119,118)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل کر ہی حقیقی توحید کا علم ہو سکتا ہے۔ آپؐ کے اُسوہ پر عمل کر کے ہی ہم اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتے ہیں اور یہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعوے کی بنیاد ہے۔...

پس آج اگر حقیقی خوشی منانی ہے تو پھر آپ کے اُسوہ پر عمل کر کے منائی جا سکتی ہے جہاں عبادتوں کے معیار بھی بلند ہوں۔ جہاں توحید پہ بھی کامل یقین ہو اور اعلیٰ اخلاق کے معیار بھی بلند ہوں۔ اگر یہ نہیں تو ہم میں اور غیر میں کوئی فرق نہیں۔... حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر کام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کو سامنے رکھیں۔ اللہ کرے کہ اس کی ہم سب کو توفیق ملے۔''

(خطبہ جمعہ بیان فرمودہ مؤرخہ یکم دسمبر 2017ء بحوالہ ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل جلد 24 شمارہ 51 مؤرخہ 22 تا 28 دسمبر 2017ء صفحہ 5 تا 9)

ہستی باری تعالیٰ

خدا تعالیٰ کی ہستی کی دلیل ”قبولیت دعا“

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حقیقۃ الوحی میں فرماتے ہیں:

”سردار نواب محمد علی خان صاحب رئیس مالیر کوٹلہ کا لڑکا عبد الرحیم خاں ایک شدید محرقہ تپ کی بیماری سے بیمار ہو گیا تھا اور کوئی صورت جانبری کی دکھائی نہیں دیتی تھی، گویا مردہ کے حکم میں تھا۔ اس وقت میں نے اس کے لئے دعا کی تو معلوم ہوا کہ تقدیر مبرم کی طرح ہے۔ تب میں نے جناب الٰہی میں عرض کی کہ یا الٰہی! میں اس کے لئے شفاعت کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ نے فرمایا مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ یعنی کس کی مجال ہے کہ بغیر اذن الٰہی کے کسی کی شفاعت کر سکے۔ تب میں خاموش ہو گیا۔ بعد اس کے بغیر توقف کے یہ الہام ہوا اِنَّکَ اَنۡتَ الۡمُجَاز یعنی تجھے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی۔ تب میں نے بہت تضرع اور ابتہال سے دعا کرنی شروع کی تو خدا تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور لڑکا گویا قبر میں سے نکل کر باہر آیا اور آثار صحت ظاہر ہوئے اور اس قدر لاغر ہو گیا تھا کہ مدت دراز کے بعد وہ اپنے اصلی بدن پر آیا اور تندرست ہو گیا اور زندہ موجود ہے۔“ (”حقیقۃ الوحی“ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 230,229)

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”دلیل جو قرآن شریف سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت میں ملتی ہے یہ ہے کہ وہ دعاؤں کو قبول کرتا ہے جب کوئی انسان گھبرا کر اس کے حضور میں دعا کرتا ہے تو وہ اسے قبول کرتا ہے۔ اور یہ بات کسی خاص زمانہ کے متعلق نہیں بلکہ ہر زمانہ میں اس کے نظارے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ۔ (البقرۃ:187) یعنی جب میرے بندے میری نسبت سوال کریں تو انہیں کہہ دو کہ میں ہوں اور پھر قریب ہوں پکارنے والے کی دعا کو سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے پس چاہیئے کہ وہ بھی میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پائیں۔

اب اگر کوئی شخص کہے کہ کیونکر معلوم ہو کہ دعا خدا سنتا ہے کیوں نہ کہا جائے کہ اتفاقاً بعض دعا کرنے والے کے کام ہو جاتے ہیں جیسے بعض کے نہیں بھی ہوتے۔ اگر سب دعائیں قبول ہو جائیں تب بھی کچھ بات تھی لیکن بعض کے قبول ہونے سے کیونکر معلوم ہو کہ اتفاق نہ تھا بلکہ کسی ہستی نے قبول کر لیا تو اسکا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت اپنے ساتھ نشان رکھتی ہے۔ چنانچہ ہمارے آقا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ثبوت باری تعالیٰ کی دلیل میں یہ پیش کیا تھا کہ چند بیمار جو خطرناک طور پر بیمار ہوں چُنے جائیں اور بانٹ لئے جائیں اور ایک گروہ کا ڈاکٹر علاج کریں اور ایک طرف میں اپنے حصہ والوں کیلئے دعا کروں پھر دیکھو کہ کس کے بیمار اچھے ہوتے ہیں۔ اب اس طریق امتحان میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ایک سگ گزیدہ جسے دیوانگی ہو گئی اور جس کے علاج سے کسولی کے ڈاکٹروں نے قطعاً انکار کر دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ اس کا کوئی علاج نہیں اس کے لئے آپ نے دعا کی اور وہ اچھا ہو گیا حالانکہ دیوانے کتے کے کٹے ہوئے دیوانہ ہو کر کبھی اچھے نہیں ہوتے۔ **پس دعاؤں کی قبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو انہیں قبول کرتی ہے اور دعاؤں کی قبولیت کسی خاص زمانہ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ ہر زمانے میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔** جیسے پہلے زمانہ میں دعائیں قبول ہوتی تھیں ویسے ہی اب بھی ہوتی ہیں۔" ("دس دلائل ہستی باری تعالیٰ" حضرت مصلح موعودؓ، انوار العلوم جلد 1 صفحہ 427,426)

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہٗ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ غیر مسلموں کو بھی احمدیوں کی دعاؤں کی قبولیت کے ایسے نظارے دکھاتا ہے جو ان کو اس بات کا قائل کر دیتے ہیں کہ اسلام کا خدا دعاؤں کا سننے والا خدا ہے۔ مرزا افضل صاحب کینیڈا سے لکھتے ہیں کہ ہم وینکوور کے مغرب میں ایک انٹر فیتھ کانفرنس میں ایک شہر میں گئے اور ایک فون بک دیکھ کر ایک سکھ کو فون کیا کہ ہم یہاں انٹر فیتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمیں اپنے گھر خوش آمدید کہا۔ کھانا کھلایا۔ اپنے گھر میں ہی ہمیں ظہر عصر کی نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ انہوں نے کانفرنس میں ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ جب ہم چلنے لگے تو انہوں نے نہایت عاجزی سے کہا کہ اس کے بیٹے کی تین بیٹیاں ہیں اور یہ کہ ہم دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بیٹا بھی دے دے۔ کہتے ہیں ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ ہاتھ اٹھا کے وہیں دعا بھی کی اور انہیں بتایا کہ ہم اپنے خلیفہ کو بھی دعا کے لئے لکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے پھر ایک ڈیڑھ سال کے بعد ان کا بڑا خوشی سے فون آیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پوتا عطا فرمایا ہے۔" (خطبہ جمعہ بیان فرمودہ مؤرخہ 26 جنوری 2018ء بحوالہ ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل جلد 25 شمارہ 07 مؤرخہ 16 تا 22 فروری 2018ء صفحہ 7)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَلْمَغَازِیْ لِمُوْسیٰ بِنْ عُقْبَۃ

(ابن رفیق)

سیرت نبویؐ کے موضوع اور اس کے مطالعہ کی اہمیت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت اسلام کے ابتدائی ایام کے روشن صفحات میں بنیادی نقطہ آغاز اور پہلا ستون ہے اور یہی وہ منہج ہے جو درندوں سے انسان، پھر بااخلاق انسان، اور پھر بااخلاق انسان سے باخدا انسان بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں علماء نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ یہ علماء نہ صرف اس موضوع کو کڑی جانچ پڑتال و جرح و تعدیل کے بعد ضبطِ تحریر میں لائے، بلکہ اسے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ بھی کیا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا مضمون ہے جو ہمیشہ سے ہی تحقیق و تفتیش کا متقاضی رہا ہے۔ اور یہ ضروری بھی تھا کیونکہ اس مضمون کا ایک بڑا حصہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر پر مشتمل ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں سنت کہا جاسکتا ہے، جو کہ شریعتِ اسلامی کا دوسرا اہم ترین جزو ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کے اولین طبقہ میں عروہ بن الزبیرؒ، محمد ابن شہاب الزہریؒ، موسیٰ بن عقبہؒ، محمد ابن اسحاقؒ، ابو معشر السندیؒ، الواقدیؒ اور محمد ابن سعدؒ ہیں۔ ان علماء نے بعد میں آنے والے سیرت نگاروں کے لئے اصول و ضوابط قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تاہم قابل غور بات یہ ہے کہ ان علماء کی اکثر تصانیف یا تو گم ہو چکی ہیں یا مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچی ہیں، جیسے کہ عروہ بن الزبیرؒ کی کتاب المغازی، جس کی روایات ایک مدت تک صرف بعد کے سوانح نگاروں کے اقتباسات کے

ذریعے ان کی طرف انتساب کے ذریعے پہنچی تھیں۔ لیکن 1981ء میں ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی (استاد حدیث نبویؐ، جامعہ ریاض، سعودی عرب) نے ان کو کتاب کی شکل میں عربی زبان میں ریاض سے شائع کیا۔

ابن شہاب الزہریؒ کی کتاب "المغازی" بھی سیرت اور احادیث کے ساتھ ساتھ مغازی کو جمع کرنے میں بڑی دلچسپی اور محنت کے باوجود مکمل طور پر ایک کتاب میں ہم تک نہیں پہنچ سکی۔

جہاں تک موسیٰ بن عقبہؒ کی مغازی کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ بھی ان کے پیشروؤں کی تصانیف سے مختلف نہیں، ان کی روایتیں بھی ہم تک پوری طرح سے نہیں پہنچیں۔ موسیٰ بن عقبہؒ اپنے سے پہلے سیرت و مغازی نگاروں سے اس لئے ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب بطورِ خاص مغازی کو مدِ نظر رکھ کر تالیف کی۔ اور متعدد راویوں نے ان سے روایت کی۔ ان رواۃ میں امام مالکؒ کی شخصیت بھی شامل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِمَغَازِي مُوسَىٰ، فَإِنَّهُ رَجُلٌ ثِقَةٌ، طَلَبَهَا عَلَىٰ كِبَرِ السِّنِّ لِيَقِيدَ مَن شَهِدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلَمْ يُكَثِّرْ كَمَا كَثَّرَ غَيْرُهُ۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ 114 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

ترجمہ: تم موسیٰ کی مغازی کا مطالعہ کرو۔ وہ ایک ثقہ آدمی تھے جنہوں نے بڑھاپے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شاملین کو تلاش کیا تاکہ ان واقعات کو محفوظ کریں، اور اس میں دوسرے لوگوں کی طرح اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس طرح علامہ ابن حجر رحمہ اللہ ان کی کتاب "المغازی" کو أَصَحُّ الْكِتَابِ فِي الْمَغَازِي قرار دیتے ہیں۔

(فتح الباری کتاب المغازی باب فی غزوہ موتہ)

مصنف کا تعارف:

آپ کا نام موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش تھا۔ کنیت ابو محمد تھی، آپ قریش کے قبیلے بنی اسد بن خزیمہ کے موالی میں سے تھے، جبکہ بعض کے نزدیک آپ آلِ زبیر بن العوام کے موالی میں سے تھے، اور آپکے دادا کو حضرت زبیر بن العوامؓ نے آزاد کیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ عبد اللہ ابن الزبیر کے مولیٰ تھے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ ام خالدؓ بنت خالد بن سعید بن العاصؓ جو کہ زبیر بن العوامؓ کی بیوی تھیں، کے مولیٰ تھے۔ آپ کی والدہ کا نام فلانہ بنت ابی حبیبہ تھا۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ 114 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

آپ کی پیدائش مدینہ میں ہوئی۔ آپ کی پیدائش کا زمانہ اندازاً 55 ہجری سے پہلے کا ہے۔ آپ کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ہمراہ 68ھ میں حج کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ حج نَجْدَۃُ الْحُرُوْرِی کے حج کے نام سے مشہور ہے۔ اسے نَجْدَۃُ الْحُرُوْرِی کا حج اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سال عرفات میں خوارج نے نجدہ کی امارت میں اپنا ایک الگ علم نصب کیا تھا۔ لہٰذا اس حج کا نام نَجْدَۃُ الْحُرُوْرِی کا حج پڑ گیا۔ (نَجْدَۃُ الْحُرُوْرِی خوارج کے فرقہ حُرُوْرِیَّہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ فرقہ جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ سے جدا ہو کر حُرُوْرِیَّہ نامی جگہ پر جمع ہوا تھا جس کی وجہ سے حُرُوْرِیَّہ کہلایا۔ نجدہ نے بحرین اور اس سے ملحقہ علاقوں میں پانچ سال حکومت کی، اور 69ھ میں مارا گیا)۔

(تاریخ طبری جلد 4 حصہ دوم صفحہ 69 نفیس اکیڈمی، کراچی 2004ء)

صحابہؓ و صحابیاتؓ اور تابعینؒ سے اکتسابِ فیضِ حدیث:

جن صحابہؓ و صحابیاتؓ سے آپ نے کسبِ حدیث اور روایات کیں ان کے نام یہ ہیں: ام خالدؓ، ابنِ عمرؓ، سھل بن سعد الساعدیؓ، اور انس ابن مالکؓ۔ تابعین میں جن شخصیات سے حصولِ علم کیا ان میں علقمہ بن وقاص اللیثیؒ، ابو سلمہ بن عبد الرحمنؒ، سالم بن عبد اللہ بن عمرؒ، ان کے بھائی حمزہؒ، عبد الرحمٰن بن ہرمز الاعرجؒ، نافع بن جبیر بن مطعمؒ، نافع ابن عمرؓ کے غلام، عروہؒ، عکرمہؒ، ابن عباسؓ کے غلام، الزہریؒ، ابو الزناد عبد اللہ بن ذکوانؒ، محمد بن منکدرؒ، عطاء سلیمیؒ، عبد اللہ بن دینارؒ، محمد بن یحییٰ بن حبانؒ اور حمزہ بن عبد اللہ بن عمرؒ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ 115,114 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

تلامذہ:

علماء کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنے علم کو عوام الناس میں بانٹنا چاہتے ہیں، اور اس غرض سے متعدد علمی مجالس کا انعقاد کرتے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہؒ کا بھی یہی شیوہ تھا، جو علم آپ نے صحابہؓ و صحابیاتؓ اور تابعین سے حاصل کیا اسے اپنے شاگردوں تک پہنچایا۔ آپ کے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفزاریؒ، سفیان الثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، شعبہ ابن الحجاجؒ، مالک بن انسؒ، بکیر بن عبد اللہؒ، یحییٰ بن سعیدؒ، ابن جریجؒ، ابراہیم بن طہمانؒ، اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہؒ، وغیرہم۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ 115 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

تصانیف:

تاریخ کے اوراق میں آپ کی ایک ہی کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو کہ مغازی کے متعلق ہے، یہ کتاب بھی مرورِ زمانہ

سے نایاب ہوچکی تھی، تاہم موسیٰ بن عقبہؒ کی روایات کو پروفیسر محمد باقشیش نے مراکش کے جامعہ ابن زھر کے لئے ایک مقالہ کے طور پر جمع کر کے 1994ء میں شائع کیا۔

وفات:

آپ کی وفات 141ھ میں مدینہ میں ہوئی اور وہیں تدفین ہوئی۔ تاہم ایک دوسری روایت کے مطابق آپ کی وفات 142ھ میں ہوئی۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد6 صفحہ 117 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

تعارف کتاب:

موسیٰ بن عقبہؒ کی کتاب کو سیرت کی ابتدائی کتب میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کی کتاب میں بطورِ خاص صرف جنگوں اور ان سے متعلق واقعات کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں اوّلین ذکر حربِ فجار کا ہے اور 63ھ میں واقعۂ حرہ تک کی جنگوں کا تذکرہ ہے۔

وجہ تصنیف:

موسیٰ بن عقبہؒ جہاں ایک ثقہ محدث تھے، وہیں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے غیرت بھی رکھتے تھے، علامہ ذہبی کے مطابق ان کے کتاب المغازی لکھنے کی وجہ کچھ یوں تھی کہ مدینہ میں ایک شخص شرحبیل ابوسعد "مغازی" کے متعلق کافی علم رکھتا تھا، لوگوں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ شاملین بدر میں ایسے لوگوں کا اضافہ کرتا ہے جو کہ اس موقع پر موجود نہ تھے، اسی طرح احد کے شہداء اور مہاجرین حبشہ و مدینہ میں بھی اپنی طرف سے بعض نام شامل کر رہا ہے، پس وہ ان لوگوں کے الزام کا کوئی جواب نہ دے سکا اور لوگوں نے اس کے قول اور علم کو رد کر دیا۔ جب موسیٰ بن عقبہؒ تک یہ بات پہنچی تو ان کو حیرانگی ہوئی کہ کیا کوئی شخص اس قسم کی جرأت بھی کر سکتا ہے؟(یعنی روایات میں اپنی طرف سے ردّوبدل)۔ چنانچہ بڑھاپے کے باوجود آپؒ نے تحقیق و تدقیق کے بعد شاملین بدر، احد، اور مہاجرینِ حبشہ و مدینہ کے اسماء و حالات کو اکٹھا کیا اور یہ کتاب تالیف کی۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد6 صفحہ 116 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

آپؒ کے مصادر:

تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مغازی موسیٰ بن عقبہ کی جمع و تدوین میں نہایت چھان بین سے کام لیا گیا ہے اور

تقریباً 20 کے قریب محدثین ثقہ سے روایات اخذ کی گئی ہیں۔ ان کے اسماء درج ذیل ہیں:

علامہ ابنِ شہاب الزہری: ان سے آپؒ نے 115 روایات لیں۔

نافع مولیٰ ابن عمرؓ: ان سے 26 روایات لیں۔

(سیر اعلام النبلاء جلد 5 صفحہ 326 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

سالم بن عبد اللہؒ: ان سے 15 روایات اخذ کیں۔ سالم حضرت عمرؓ کے پوتے تھے۔

ابو حبیبہ مولیٰ زبیرؓ: ان سے 6 روایات لیں۔ یہ موسیٰؒ کے نانا تھے۔

("طبقات ابنِ سعد" جلد 3 صفحہ 231 نفیس اکیڈمی، کراچی)

کریب مولیٰ ابن عباسؓ: ان سے آپؒ نے 5 روایات لیں۔ (سیر اعلام النبلاء، جلد 4 صفحہ 479)

عبد اللہ بن فضل بن عباسؓ: ان سے 2 روایات لیں۔

دیگر محدثین کے نام ہیں: حمزہ بن عبد اللہ بن عمرؒ، عبد اللہ بن دینارؒ، ابو الزبیر محمد بن تدرسؒ، المنذر ابن جہمؒ، المرقعؒ، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰنؒ، عبد اللہ بن ابی لبیدؒ، محمد ابن ابی بکر ابن حزمؒ، ایمن بن نابلؒ، سعد بن ابراہیمؒ، الضحاک بن خلیفہؒ، علقمہ بن وقاص لیثیؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، موسیٰ بن عقبہؒ کی والدہ۔ وغیرہم۔ موسیٰ بن عقبہؒ کی مغازی میں کل 221 روایات ہیں۔

(المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش صفحہ 28 جامعہ ابن زہر، مراکش 1994ء)

موسیٰ بن عقبہؒ کی مغازی کا ان سے پہلی مغازی سے موازنہ:

موسیٰ بن عقبہ کے اسلوب اور منہج تحقیق کے تذکرہ کے بعد خاکسار ان کی کتاب کا مغازی عروہ بن زبیرؒ اور سیرت ابنِ اسحاق سے تقابلی جائزہ پیش کرے گا۔ عروہ بن زبیرؒ تو موسیٰ بن عقبہؒ کے استاد تھے اور محمد بن اسحٰق آپ کے ہم عصر تھے۔

المغازی موسیٰ بن عقبہؒ اور مغازی عروہ بن زبیرؒ کا تقابلی جائزہ:

عروہ بن زبیرؒ موسیٰ کے استاد تھے، اور دونوں کا تعلق مدینہ سے تھا۔ دونوں مغازی کے متعلق روایات کی جمع و تدوین کا شوق رکھتے تھے اور حتی الوسع دیانت داری سے اس کام کو سرانجام دیا۔ دونوں کی کتب ہم تک براہِ راست نہیں پہنچیں، بلکہ دیگر کتب و رواۃ کے توسط سے ہم تک ان کی روایات پہنچی ہیں۔ پس اگر کوئی قاری ان دو کتب کا مطالعہ کر کے کسی ایک کی فوقیت ثابت کرنا چاہے تو یہ امر اس کے لئے شدید مشکل ہو گا کیونکہ:

i۔ دونوں اشخاص کا روایات کو بیان کرنے کا منہج و اسلوب ایک ہی ہے۔

ii۔ کسی بھی واقعہ کے متعلق قرآنی آیات سے حوالہ دینے اور ربط قائم کرنے میں موسیٰ بھی عروہ بن زبیرؒ کی پیروی کرتے ہیں۔

iii۔ دونوں اشخاص اگر کسی واقعہ میں کسی شعری کلام کا ذکر کرتے ہیں تو صرف معیّنہ اشعار، جو اس واقعہ سے متعلق ہوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

iv۔ دونوں ہی نسب کے بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

v۔ موضوع سے غیر متعلقہ تفاصیل کو حذف کر دیتے ہیں۔

vi۔ موسیٰ بن عقبہؒ اور عروہ بن زبیرؒ کی روایات میں دیگر راویوں کی روایات کے مقابلے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔

vii۔ موسیٰ کی کئی روایات حرفاً حرفاً عروہؒ کی روایات سے مطابقت رکھتی ہیں۔ حالانکہ موسیٰ نے اپنی مغازی میں عروہؒ کے حوالے سے کوئی روایت درج نہیں کی۔

(مغازی رسولؐ از عروہ بن زبیرؒ صفحہ 82 ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1987ء)

روایات کے بیان میں الفاظ کی مماثلت کی ایک مثال پیش ہے۔ پہلی عبارت موسیٰ بن عقبہؒ کی ہے، جبکہ دوسری روایت عروہ بن زبیرؒ کی ہے۔

"هَذَا حَدِيثُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ حِينَ خَرَجَ إِلَى بَنِي النَّضِيرِ، يَسْتَعِينُهُمْ فِي عَقْلِ الْكِلَابِيِّيْنَ، وَكَانُوا زَعَمُوا قَدْ دَسُّوا إِلَى قُرَيْشٍ حِينَ نَزَلُوا بِأُحُدٍ لِقِتَالِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَحَضُّوهُمْ عَلَى الْقِتَالِ، وَدَلُّوهُمْ عَلَى الْعَوْرَةِ، فَلَمَّا كَلَّمَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي عَقْلِ الْكِلَابِيِّينَ، قَالُوا: اجْلِسْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ حَتَّى تُطْعِمَ وَتَرْجِعَ بِحَاجَتِكَ وَنَقُومُ فَنَتَشَاوَرُ، وَنُصْلِحُ أَمْرَنَا فِيمَا جِئْتَنَا لَهُ، فَجَلَسَ رَسُولُ اللّٰهِ عَلِيًّا وَمَنْ مَعَهُ مِنْ أَصْحَابِهِ فِي ظِلِّ جِدَارٍ، يَنْتَظِرُونَ أَنْ يُصْلِحُوا أَمْرَهُمْ، فَلَمَّا خَلَوْا وَالشَّيْطَانُ مَعَهُمْ، ائْتَمَرُوا بِقَتْلِ رَسُولِ اللّٰهِ، فَقَالُوا: لَن تَجِدُوهُ أَقْرَبَ مِنْهُ الآنَ، فَاسْتَرِيحُوا مِنْهُ، تَأْمَنُوا فِي دِيَارِكُمْ، وَيُرْفَعُ عَنْكُمُ الْبَلَاءُ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْهُمْ: إِنْ شِئْتُمْ ظَهَرْتُ فَوْقَ الْبَيْتِ الَّذِي هُوَ تَحْتَهُ، فَدَلَّيْتُ عَلَيْهِ حَجَرًا فَقَتَلْتُهُ، وَأَوْحَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَيْهِ فَأَخْبَرَهُ بِمَا ائْتَمَرُوا بِهِ مِنْ شَأْنِهِمْ، فَعَصَمَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ، وَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ كَأَنَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَقْضِيَ حَاجَةً، وَتَرَكَ أَصْحَابَهُ فِي مَجْلِسِهِمْ وَانْتَظَرَهُ أَعْدَاءُ اللّٰهِ، فَرَاثَ عَلَيْهِمْ، فَأَقْبَلَ رَجُلٌ مِنَ الْمَدِينَةِ فَسَأَلُوهُ عَنْهُ فَقَالَ: لَقِيتُهُ قَدْ دَخَلَ أَزِقَّةَ الْمَدِينَةِ، فَقَالُوا لِأَصْحَابِهِ: عَجَّلَ أَبُو الْقَاسِمِ أَنْ نُقِيمَ أَمْرَنَا فِي

حَاجَتِهِ الَّتِي جَاءَ لَهَا، ثُمَّ قَامَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ فَرَجَعُوا، وَنَزَلَ الْقُرْآنُ... "

(المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش صفحہ 210 جامعہ ابن زہر، مراکش 1994ء)

"خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِي نَفَرٍ مِن أَصْحَابِهِ إِلَى بَنِي النَّضِيْرِ يَسْتَعِيْنُهُمْ فِي عَقْلِ الْكِلَابِيَّيْنِ، وَكَانُوْا قَدْ دَسُّوْا إِلَى قُرَيْشٍ حِينَ نَزَلُوا بِأُحُدٍ لِقِتَالِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَصْحَابِهِ، فَحَضُّوْهُمْ عَلَى الْقِتَالِ وَدَلُّوْهُمْ عَلَى الْعَوْرَةِ، فَلَمَّا كَلَّمَهُمْ فِي عَقْلِ الْكِلَابِيَّيْنِ، قَالُوا: اجْلِسْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ حَتَّى تُطْعِمَ وَتَرْجِعَ بِحَاجَتِكَ الَّتِي جِئْتَ لَهَا، وَنَقُوْمَ فَنَتَشَاوَرَ، وَنُصْلِحَ أَمْرَنَا فِيمَا جِئْتَ لَهُ، فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَمَنْ مَعَهُ مِنْ أَصْحَابِهِ إِلَى ظِلِّ جِدَارٍ، يَنْتَظِرُ أَنْ يُصْلِحُوْا أَمْرَهُمْ، فَلَمَّا دَخَلُوْا، وَمَعَهُمُ الشَّيْطَانُ لَا يُفَارِقُهُمْ، ائْتَمَرُوْا بِقَتْلِهِ، وَقَالُوا: لَا تَجِدُوْنَهُ أَقْرَبَ مِنْهُ السَّاعَةَ، اسْتَرِيحُوْا مِنْهُ، تَأْمَنُوْا فِي دِيَارِكُمْ، وَيُرْفَعْ عَنْكُمُ الْبَلَاءُ، قَالَ رَجُلٌ مِنْهُمْ: إِنْ شِئْتُمْ رَقِيْتُ عَلَى الْجِدَارِ الَّذِي هُوَ تَحْتَهُ، فَدَلَّيْتُ عَلَيْهِ حَجَرًا فَقَتَلْتُهُ، فَأَوْحَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَيْهِ، فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كَأَنَّهُ يُرِيْدُ أَنْ يَقْضِيَ حَاجَةً، وَتَرَكَ أَصْحَابَهُ مَكَانَهُمْ، وَأَعْدَاءُ اللهِ فِي نَجِيِّهِمْ، فَلَمَّا فَرَغُوا وَقَضَوْا حَاجَتَهُمْ وَأَمْرَهُمْ فِي مُحَمَّدٍ، أَتَوْا فَجَلَسُوا مَعَ أَصْحَابِ نَبِيِّ اللهِ يَنْتَظِرُوْنَهُ، فَأَقْبَلَ رَجُلٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ بَعْدَ أَنْ رَاثَ عَلَيْهِمْ، فَسَأَلُوْا عَنْهُ، فَقَالَ: لَقِيْتُهُ عَامِدًا الْمَدِينَةَ، قَدْ دَخَلَ أَزِقَّتَهَا، فَقَالُوا: عَجِلَ أَبُو الْقَاسِمِ أَنْ نُقِيْمَ أَمْرَنَا فِي حَاجَتِهِ الَّتِي جَاءَ لَهَا، ثُمَّ قَامَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَرَجَعُوْا، وَنَزَلَ الْقُرْآنُ۔"

(مغازی رسولؐ از عروہ بن زبیرؒ صفحہ 172 ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1987ء)

ان دونوں روایات میں کم و بیش ایک طرح کے ہی الفاظ اور واقعات کی ترتیب بیان ہوئی ہے۔

موسیٰ بن عقبہؒ اور عروہ بن زبیرؒ کی روایات میں دوسرے راویوں کے برخلاف مماثلت کی کچھ مثالیں پیش ہیں:

ابنِ اسحاق کے مطابق آنحضور ﷺ سے اوّلین ملاقات کرنے والے انصار کی تعداد 6 تھی، (سیرت ابن ہشام، حصہ 2 صفحہ 48، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور) جبکہ موسیٰ بن عقبہؒ (المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش، صفحہ 89) اور عروہ بن زبیرؒ (مغازی رسولؐ از عروہ بن زبیرؒ صفحہ 124) کے مطابق آٹھ افراد تھے، چھ خزرج سے، اور دو اوس سے۔

شہداء و مقتولین بدر کی تعداد کے بیان میں بھی دونوں اشخاص میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مطابق مسلمانوں کے شہداء میں سے 6 مہاجرین تھے، جبکہ 8 انصار تھے۔ جبکہ مشرکین کے 49 افراد قتل اور 39 افراد قید ہوئے۔ (المغازی

لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش، صفحہ 143، مغازی رسول ؐاز عروہ بن زبیرؒ صفحہ 88) جبکہ صحیح بخاری کے مطابق مکہ والوں کے 70 مقتول اور 70 قید ہوئے۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی، باب فضل من شھد بدر حدیث:3986)

اسی طرح فتح مکہ کے موقعے پر ان اصحاب کے مطابق ابو سفیان اور حکیم بن حزام، دونوں کے گھروں کو امان گاہ قرار دیا گیا تھا۔(مغازی موسیٰ بن عقبہ صفحہ 273 اور مغازی رسول ؐ از عروہ بن زبیرؒ صفحہ 215) جبکہ دیگر مؤرخین و سیرت نگار صرف ابو سفیان کے گھر کا ذکر کرتے ہیں۔

بعض روایات میں موسیٰ بن عقبہؒ اور عروہ بن زبیرؒ میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، مثلاً صلح حدیبیہ کے لئے مسلمانوں کے مدینہ سے نکلنے کی تاریخ کے متعلق موسیٰ کا مؤقف ہے کہ 6ھ ذوالقعدہ کی 2 تاریخ کو نکلے، جبکہ عروہ بن زبیرؒ کے مطابق اسی سال رمضان میں نکلے اور صلح شوال میں ہوئی۔

(امتاع الاسماع از عبد القادر بن محمد المقریزی صفحہ 275 دار الکتب العلمیہ، بیروت)

المغازی موسیٰ بن عقبہؒ اور سیرت ابن اسحاق کا تقابلی جائزہ:

جہاں تک سیرت ابن اسحاق کا تعلق ہے تو یہ وہ قدیم ترین کتاب ہے جو تقریباً مکمل صورت میں ابن ہشام یا دیگر مؤرخین کی تصانیف میں ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موسیٰ بن عقبہؒ اور ابنِ اسحاق دونوں ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لئے ان کا طبقہ بھی ایک ہے۔ دونوں اشخاص ایک ہی علاقے یعنی مدینہ میں رہائش پذیر تھے، سوائے اس کے کہ اپنی آخری عمر میں ابن اسحاق نے بغداد میں سکونت اختیار کی۔ یہ دونوں علامہ زھری کے شاگرد تھے۔ تاہم جس طرح موسیٰ بن عقبہؒ کی ثقاہت پر علماء کا اجماع نظر آتا ہے، وہیں ابن اسحٰق کے متعلق شیعیت اور مسئلۂ قدر کے حوالے سے الزامات لگائے جاتے ہیں۔

(المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش صفحہ 42 جامعہ ابن زھر، مراکش 1994ء)

علامہ ذھبیؒ ابن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ کی تصانیف کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابن اسحاق نے روایات اور انساب کے بیان میں طوالت سے کام لیا ہے، اور اشعار کے بیان میں صرف متعلقہ اشعار کا ذکر کرتے ہیں، تاہم ان کی بیان کردہ بعض روایایت استناد کا درجہ نہیں رکھتیں، اور ان کی کتاب میں تصحیح و تنقیح کی گنجائش موجود ہے ... ... جہاں تک موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا تعلق ہے تو یہ کتاب زیادہ ضخامت نہیں رکھتی، اور اس کی

بیان کردہ روایات صحیح، مرسل اور جیّد ہیں، تاہم یہ کتاب مختصر ہے، اور اکثر مقامات پر توضیح کی متقاضی ہے۔“

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ 116 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

موسیٰ بن عقبہ نے روایات کے جمع کرنے میں محدثین کے طریق کو اختیار کیا ہے اور وہ تمام احتیاطیں برتی ہیں جو احادیث کی جمع و تدوین میں برتی گئی تھیں، تاہم ابن اسحٰق نے مختلف تاریخی روایات اور اسرائیلیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ کی مغازی میں تمام روایات مسلمان علماء کے توسط سے ہیں (یعنی راوی مسلمان ہیں)، جبکہ ابن اسحاق کی تاریخ میں حدیث و تفسیر سے متعلق روایات تو مسلمان علماء سے ہی ہیں، جبکہ مغازی کے متعلق روایات میں غیر مسلم رواۃ کی روایات بھی شامل ہیں۔　　　(المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش صفحہ 43 جامعہ ابن زہر، مراکش 1994ء)

علماء کی موسیٰ بن عقبہؒ اور ان کی کتاب کے متعلق رائے:

- یحییٰ بن معین کے نزدیک کتب مغازی میں موسیٰ بن عقبہؒ کی کتاب "من اصح ھذہ الکتب" ہے۔
- امام احمد بن حنبل، امام النسائی، اور ابو حاتم کے نزدیک موسیٰ بن عقبہ ثقہ راوی تھے۔
- واقدی لکھتا ہے کہ بنی عقبہ یعنی موسیٰ، محمد، اور ابراہیم بن عقبہ مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے تھے اور یہ سب کے سب فقہاء اور محدثین تھے، جبکہ موسیٰ فتاویٰ بھی دیا کرتے تھے۔
- امام مالکؒ کی رائے میں جس شخص کے متعلق موسیٰ بن عقبہؒ کی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بدر میں شامل تھا، تو وہ شامل تھا۔
- امام شافعیؒ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ لَیْسَ فِی الْمَغَازِی أَصَحُّ مِنْ کِتَابِہٖ مَعَ صُغْرَةٍ وَخِلُوُّهٗ مِنْ أَکْثَرِ مَا یُذْکَرُ فِی کُتُبِ غَیْرِہٖ۔　　　(المغازی لموسیٰ بن عقبہ، پروفیسر محمد باقشیش صفحہ 19)

مفہوماً ترجمہ: جنگوں میں اس کی کتاب سے زیادہ مستند کوئی کتاب نہیں۔ اگرچہ وہ مختصر ہے اور اس میں سے اکثر (یعنی تفصیل) سے خالی ہے جو دوسروں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

- ابن سعد کے مطابق موسیٰ بن عقبہؒ کی ثقاہت میں کوئی شبہ نہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد 6 صفحہ تا 117 از امام شمس الدین ذہبی مؤسسۃ الرسالہ بیروت، 1982ء)

تعارف کتاب ”براہین احمدیہ حصّہ سوم“

وہ خزائن جو ہزاروں سال سے مدفون تھے

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”سب دوستوں کے واسطے ضروری ہے کہ ہماری کتب کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں۔ کیونکہ علم ایک طاقت ہے اور طاقت سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔“

(”ملفوظات“ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جلد 7 صفحہ 224 ایڈیشن 2022ء)

”اس احقر نے 1864ء تا 1865ء عیسوی میں یعنے اسی زمانے کے قریب کے جب یہ ضعیف اپنی عمر کے پہلے حصہ میں ہنوز تحصیل علم میں مشغول تھا جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ اور اس وقت اس عاجز کے ہاتھ میں ایک دینی کتاب تھی کہ جو خود اس عاجز کی تالیف معلوم ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو دیکھ کر عربی زبان میں پوچھا کہ تو نے اس کتاب کا کیا نام رکھا ہے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ اس کا نام میں نے قطبی رکھا ہے۔“

براہین احمدیہ حصّہ سوم

(اے۔ولیم)

تعارف:

براہین احمدیہ کا پہلا حصّہ جو کہ 82 صفحات پر مشتمل تھا 1880ء میں اور دوسرا حصّہ جو کہ 56 صفحات (ایڈیشن اوّل) پر مشتمل تھا وہ بھی 1880ء میں شائع ہوا اور اس کا تیسرا حصّہ 1882ء میں شائع ہوا جو کہ 150 صفحات پر مشتمل تھا۔ اور چوتھا حصّہ 1884ء میں شائع ہوا جو کہ 390 کے قریب صفحات پر مشتمل تھا۔

تیسرا حصّہ روحانی خزائن جلد اوّل کے صفحہ نمبر 133 سے صفحہ نمبر 312 تک ہے۔ اس تیسرے حصّے کا مختصر سا

تعارف قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

❁ اس حصّہ کے آغاز میں مسلمانوں کی کمزور عملی حالت، بے توجہگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھاہے: ”آج کل غربت اسلام کی علامتیں اور دین متین محمدی پر مصیبتیں ایسی ظاہر ہو رہی ہیں کہ جہاں تک زمانہ بعثت حضرتِ نبویؐ کے بعد میں ہم دیکھتے ہیں کسی قرن میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ اس سے زیادہ تر اور کیا مصیبت ہوگی کہ مسلمان لوگ دینی غمخواری میں بغایت درجہ سست اور مخالف لوگ اپنے اعتقادوں کی ترویج اور اشاعت میں چاروں طرف سے کمربستہ اور چست نظر آتے ہیں۔ جس سے دن بدن ارتداد اور بدعقیدگی کا دروازہ کھلتا جاتا ہے۔ اور لوگ فوج در فوج مرتد ہو کر ناپاک عقائد اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے مخالف جن کے عقائد فاسدہ بدیہی البطلان ہیں۔ دن رات اپنے دین کی حمایت میں سرگرم ہیں بحدّیکہ یورپ اور امریکہ میں عیسائی دین کے پھیلانے کے لئے بیوہ عورتیں بھی چندہ دیتی ہیں۔ اور اکثر لوگ مرتے وقت وصیت کر جاتے ہیں کہ اس قدر تر کہ ہمارا خالص مسیحی مذہب کے رواج دینے میں خرچ ہو۔

مگر مسلمانوں کا حال کیا کہیں اور کیا لکھیں کہ ان کی غفلت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ نہ وہ آپ دین کی کچھ غمخواری کرتے ہیں اور نہ کسی غمخوار کو نیک ظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیئے کہ غمخواریٔ دینی کا کیسا موقعہ تھا۔ اور خدمت گزاری کا کیا ضروری محل تھا کہ کتاب براہین احمدیہ کہ جس میں تین سو مضبوط دلیل سے حقیّت اسلام ثابت کی گئی ہے اور ہر ایک مخالف کے عقائد باطلہ کا ایسا استیصال کیا گیا ہے کہ گویا اس مذہب کو ذبح کیا گیا کہ پھر زندہ نہیں ہوگا۔ اس کتاب کے بارے میں بجز چند عالی ہمت مسلمانوں کے جن کی توجہ سے دو 2 حصے اور کچھ تیسرا حصہ چھپ گیا۔ جو کچھ اور لوگوں نے اعانت کی وہ ایسی ہے کہ اگر بجائے تصریح کے صرف اسی پر قناعت کریں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن تو مناسب ہے۔“

(”براہین احمدیہ حصہ سوم“ روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 134)

❁ اوراس کے ساتھ ساتھ براہین احمدیہ کی ضخامت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے کتاب کی قیمت 100 روپے رکھنے کا ارادہ تھا لیکن آپ نے پھر بھی قیمت نہیں بڑھائی اور کتاب کی لاگت کا سارا خسارہ خود برداشت کرنا گوارا کر لیا چنانچہ لکھا: ”اور اس جگہ یہ امر بھی واجب الاطلاع ہے کہ پہلے یہ کتاب صرف تیس پینتیس جز تک تالیف ہوئی تھی اور پھر سو جز تک بڑھادی گئی اور دس روپیہ عام مسلمانوں کے لئے اور پچیس روپے دوسری قوموں اور خواص کے لئے مقرر ہوئی۔ مگر اب یہ کتاب بوجہ احاطہ جمیع ضروریات تحقیق و تدقیق اور اتمام حجت کے لئے تین سو جز تک پہنچ گئی ہے جس کے مصارف پر نظر کر کے یہ واجب معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ قیمت کتاب سو روپیہ رکھی جائے۔ مگر بباعث پست ہمتی اکثر لوگوں کے یہی قرین مصلحت معلوم ہوا کہ اب وہی قیمت مقررہ سابقہ کہ گویا کچھ بھی نہیں ایک دوامی قیمت قرار

پاوے۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 134،135)

❁ ان دنوں مسلمانوں کی ترقی تعلیم و ملازمت اور مدارس میں اردو زبان قائم کرنے کے لئے گورنمنٹ کو ایک درخواست بھیجنے پر **حضور علیہ السلام نے ایک ایسی اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ جو آج بھی ہم سب کے لئے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور زندگی کے کسی بھی میدان عمل کے لئے وہ یکساں رہبر و رہنما ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے خود تو کچھ ہاتھ پاؤں مارے جائیں، کوشش کی جائے پھر کسی سے مدد و استمداد کا ہاتھ مانگا جائے**۔ چنانچہ فرمایا: "ہر یک کام دینی ہو یا دنیوی۔ اس میں استمداد سے پہلے اپنی خداداد طاقت اور ہمت کا خرچ کرنا ضروری ہے اور پھر اس فعل کی تکمیل کے لئے مدد طلب کرنا۔ خدا نے ہم کو ہماری ہر روزہ عبادت میں بھی یہی تعلیم دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہیں نہ یہ کہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ وَاِیَّاکَ نَعۡبُدُ۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 137،138)

❁ اس کے بعد کتاب کی پہلی فصل بعنوان: "**اُن براہین کے بیان میں جو قرآن شریف کی حقیّت اور افضلیت پر بیرونی اور اندرونی شہادتیں ہیں**" شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سے قبل کچھ تمہیدی امور ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: "قبل از تحریر براہین فصل ہذا کے چند ایسے امور کا بطور تمہید بیان کرنا ضروری ہے جو دلائل آتیہ کے اکثر مطالب دریافت کرنے اور ان کی کیفیت اور ماہیت سمجھنے کے لئے قواعد کلیہ ہیں۔ چنانچہ ذیل میں وہ سب تمہیدیں لکھی جاتی ہیں۔"

("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 143)

❁ "**تمہید اوّل**۔ بیرونی شہادتوں سے وہ واقعات خارجیہ مراد ہیں جو ایک ایسی حالت پر واقعہ ہوں کہ جس حالت پر نظر کرنے سے کسی کتاب کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہوتا ہو۔ یا اس کے منجانب اللہ ہونے کی ضرورت ثابت ہوتی ہو۔ اور اندرونی شہادتوں سے وہ ذاتی کمالات کسی کتاب کی مراد ہیں کہ خود اسی کتاب میں موجود ہوں جن پر نظر کرنے سے عقل اس بات پر قطع واجب کرتی ہو کہ وہ خدا کی کلام ہے اور انسان اس کے بنانے پر قادر نہیں۔

❁ "**تمہید دوم**۔ وہ براہین جو قرآن شریف کی حقیّت اور افضلیت پر بیرونی شہادتیں ہیں چار قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو امور محتاج الاصلاح سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو امور محتاج التکمیل سے ماخوذ ہیں۔ تیسری وہ جو امور قدرتیہ سے ماخوذ ہیں۔ چوتھی وہ جو امور غیبیہ سے ماخوذ ہیں۔ . . ." ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 143)

❁ "**تمہید سیوم**: جو چیز محض قدرت کاملہ خدائے تعالیٰ سے ظہور پذیر ہو خواہ وہ چیز اس کی مخلوقات میں سے کوئی مخلوق ہو۔ اور خواہ وہ اس کی پاک کتابوں میں سے کوئی کتاب ہو۔ جو لفظاً اور معناً اسی کی طرف سے صادر ہو۔ اس کا اس صفت سے متصف ہونا ضروری ہے کہ کوئی مخلوق اس کی مثل بنانے پر قادر نہ ہو۔" (صفحہ 149) اور اس کی تفصیل بیان کرتے

ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ: ”جبکہ یہ بات نہایت واضح اور مضبوط دلائل سے ثابت ہوتی ہے کہ بندوں کا کوئی کام بے نظیر نہیں اور خدا کے سارے کام اور جو کچھ اُس سے صادر ہوا بے نظیر ہے تو پھر اگر تم کو ایسی استقراء تام پر بھی اعتبار نہیں کہ جو خدا کے سارے قانون قدرت پر نظر کر کے بنایا گیا ہے تو عقل اور قانون قدرت کا نام نہ لو اور منطق اور فلسفہ کی بیسود کتابوں کو چاک کر کے دریابرد کرو۔

کیا تم کو یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ ایک مکھی جس کے دیکھنے سے بھی طبیعتیں کراہت کرتی ہیں وہ اپنی ظاہری صورت اور باطنی ترکیب میں ایسی بے مثل ہے کہ اس پر نظر کرنے سے اس کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن خدا کے کلام کی فصاحت اور بلاغت ایسی بے نظیر نہیں ہو سکتی جس پر نظر کرنے سے اس کلام کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت ہو۔ غافلو! اور عقل کے اندھو! کیا تمہارے نزدیک خدا کے کلام کی فصاحت بلاغت مکھی کے پروں اور پاؤں سے بھی درجہ میں کمتر اور خوبی میں فروتر ہے۔ کیا افسوس کا مقام ہے کہ ایک مچھر کی ترکیب جسمی کی نسبت تم صاف اقرار کرتے ہو کہ ایسی ترکیب انسان سے نہیں بن سکتی اور نہ آئندہ بنے گی لیکن کلام الٰہی کی نسبت کہتے ہو کہ وہ بن سکتی ہے۔ بلکہ بطور بحث اور مجادلہ کے یہ حجت پیش کرتے ہو کہ گو اب تک کوئی انسان اس کے بنانے پر قادر نہیں ہوا مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ آئندہ بھی قادر نہ ہو۔ نادانو! اس کا وہی ثبوت ہے جس کو تم مچھر اور مکھی میں اور درختوں کے ہر یک پتے میں خوب سمجھتے اور تسلیم کرتے ہو۔

مگر اس ربانی نور کے دیکھنے کے وقت تمہاری آنکھیں الو کی طرح اندھی ہو جاتی ہیں یا دھندلا جاتی ہیں۔ اس لئے تم مگس طینتی سے مگس ہی کی عظمت کے قائل ہو خدا کے نور کی عظمت کے قائل نہیں۔ جن لفظوں کو کہتے ہو کہ معانی کی طرح وہ بھی خدا ہی کے مونہہ سے نکلے ہیں اُن کو تم اس لعاب کے برابر نہیں سمجھتے کہ جو مکھی کے منہ سے نکلتا ہے یعنے تمہارے نزدیک انسان شہد بنانے پر تو قادر نہیں پر خدا کی کلام کے بنانے پر قادر ہے۔ تمہاری نگاہ میں کیڑے مکوڑے کیسے بچ گئے اور ایسے من کو بھاگئے کہ خدا کی کلام ان کی مانند بھی نہیں۔ جاہلو! اگر خدا کی کلام بے مثل نہیں تو کیڑوں اور درختوں کے پتوں کے بے مثل ہونے کی تم کو کہاں سے خبر پہنچ گئی۔ تم ذرا سوچتے نہیں کہ اگر کلام ربانی کی ترکیب میں ایک کیڑے کی ترکیب جتنی بھی کمالیت نہیں تو گویا یہ خدا پر ہی اعتراض ٹھہرا جس نے ادنیٰ کو اعلیٰ سے زیادہ تر شرف دے دیا اور ادنیٰ کو اپنی ذات پر وہ دلالتیں بخشیں کہ جو اعلیٰ کو نہیں۔“ (”براہین احمدیہ حصہ سوم“ روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 184 تا 197)

❁ قرآن کریم کے بے نظیر ہونے کے زبردست دلائل دیتے ہوئے اور اس کی فصاحت وبلاغت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ بھی چیلنج دیا کہ کوئی بھی شخص کسی بھی دینی کتاب یا عقلی طور پر الٰہیات کا کوئی نہایت باریک دقیقہ پیش کرے ہم

وہ قرآن کریم سے نکال کر دکھائیں گے۔

❁ صفحہ 151 سے حاشیہ نمبر 11 کے بقیہ کا تسلسل جاری ہے اور اس میں یعنی حصہ سوم تک جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان میں: یہ بیان فرمایا کہ جیسے جسم انسانی کے عناصر خدا کی طرف سے ہیں ایسا ہی کلام کے عناصر یعنی حروف اور الفاظ اور فقرات بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی پھر انسان اور خدا کے کلام میں فرق کیا ہے اس کا جواب ہے، پھر کلام الٰہی یعنی قرآن کریم کے بے مثل ہونے کو مزید تفصیل سے ثابت کیا ہے، ہستی باری تعالیٰ یعنی خالق وصانع کے وجود پر دلائل اور بیان، اور اس ضمن میں کلام الٰہی یا الہامی کتاب کی اہمیت یہ بتائی کہ: ”لہٰذا دہریہ کو خدا کے قائل کرنے کے لئے جیسا کلام بے مثل سے علاج متصور ہے ویسا زمین وآسمان کے ملاحظہ سے ہر گز ممکن نہیں۔“

(”براہین احمدیہ حصہ سوم“ روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 158 حاشیہ)

❁ پھر اس ضمن میں برہمو سماج کے کچھ وساوس کا جواب ہے جیسے الہام کی کوئی ضرورت نہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے الہام اور عقل کی بے نظیر تفصیل و تشریح بیان فرماتے ہوئے الہام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ محض عقل کو ایک کامیاب رہبر و رہنما کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ”میں جداً و قطعاً کہتا ہوں کہ الہام کے بغیر مجرد عقل کی پیروی میں صرف ایک نقصان نہیں بلکہ یہ وہ آفت ہے کہ کئی آفات اُس سے پیدا ہوتی ہیں جن کی تفصیل (انشاء اللہ) اپنے موقعہ پر درج ہو گی۔ خداوند کریم نے جیسا ہر یک چیز کا باہم جوڑ باندھ دیا ہے۔ ایسا ہی الہام اور عقل کا باہم جوڑ مقرر کیا ہے۔ اس حکیم مطلق کا عام طور پر یہی قانون قدرت پایا جاتا ہے کہ جب تک ایک چیز اپنے جوڑ سے الگ ہے تب تک اس کے جوہر چھپے رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات نفع کی جگہ ضرر ہوتا ہے۔ ایسا ہی عقل کا حال ہے کہ علم دین میں اس کے نیک آثار تب مترتب ہوتے ہیں جب وہ جوڑ یعنی الہام اس کے ساتھ شامل ہو جائے۔ ورنہ اپنے جوڑ کے بغیر ڈاین ہو کر ملتی ہے۔ سارا گھر نگلنے کو طیار ہو جاتی ہے۔ سارا شہر سنسان ویران کرنا چاہتی ہے۔ پر جب جوڑ میسر آ گیا تب تو چشم بددور کیا ہی پاک صورت اور پاک سیرت ہے۔ جس گھر میں رہے مالامال کر دے۔ جس کے پاس جائے اس کی سب نحوستیں اتار دے۔

تم آپ ہی سوچو کہ جوڑ کے بغیر کوئی چیز اکیلی کس کام کی؟ پھر تم کیوں یہ ادھوری عقل اس قدر ناز سے لئے پھرتے ہو۔ کیا یہ وہی نہیں جو کئی بار دروغگوئی میں رسوائیاں اٹھا چکی؟ کیا یہ وہی نہیں جس کے سر پر بار بار گرنے سے بڑے بڑے داغ موجود ہیں؟ مجھے بتایئے تو سہی کہ آپ کا جی کس پر بھرما گیا۔ یہ کہاں کی پری آ گئی جس کو دل دے بیٹھے؟ کیا تمہیں خبر نہیں کہ اس نے تم سے پہلے کتنوں کا لہو پیا۔ کتنوں کو گمراہی کے کنوئیں میں دھکیل کر مارا۔ تم جیسے کئی یاروں کو کھا چکی۔

صدہا لاشیں ٹھکانے لگا چکی۔ بھلا تم نے اس اکیلی عقل کے ذریعے سے کون سی ایسی دینی صداقتیں پیدا کی ہیں جو قرآن شریف میں پہلے سے موجود نہیں۔ زیادہ نہیں دو چار ہی دکھاؤ۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 169، 170 حاشیہ)

❁ پھر ایک دوسرے وسوسہ کا جواب ہے کہ اگر الہام کی ضرورت ثابت ہو بھی جائے کہ وہ کامل اور بے نظیر ہو تو بھی ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کو نازل بھی کیا ہو۔

❁ پھر ایک تیسرے وسوسہ: "اگر مجرد عقل کے ذریعہ سے معرفت تام و یقین تام میسر نہ ہو تب بھی کسی قدر معرفت تو حاصل ہوتی ہے وہی نجات کے لئے کافی ہے۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 179 حاشیہ) کا جواب ہے۔

❁ پھر ایک چوتھا وسوسہ یہ تھا کہ: "اگر تکمیل معرفت الہامی کتاب پر ہی موقوف ہے تو اس صورت میں بہتر یہ تھا کہ تمام بنی آدم کو الہام ہوتا تا سب لوگ براہ راست مرتبہ کمال معرفت تک پہنچ جاتے اور ربانی فیض کو بلاواسطہ حاصل کر لیتے۔ کسی دوسرے کی حاجت نہ ہوتی۔ کیونکہ اگر الہام فی نفسہ ایک جائز الوقوع امر ہے تو پھر ہر یک انسان کا ملہم ہونا جائز ہے اور اگر نہیں تو پھر کسی فرد کا بھی ملہم ہونا جائز نہیں۔" اس کا جواب دیا گیا ہے۔

("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 181 حاشیہ)

❁ اسی ذیل میں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کی بے مثل اور عرفان انگیز تفسیر بیان کرتے ہوئے کہ وحی الٰہی کے پانے والے اپنے تقدس و وَرَع میں اور اپنے اخلاق فاضلہ میں سب سے بڑھ کر ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور سیرت کا زبردست اعلیٰ وارفع بیان ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں: "وحی اللہ کے پانے کے لئے تقدّس کامل شرط ہونا کچھ ایسا امر نہیں ہے جس کے ثبوت کے دلائل کمزور ہوں یا جس کا سمجھنا سلیم العقل آدمی پر کچھ مشکل ہو۔ بلکہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی شہادت تمام زمین آسمان میں پائی جاتی ہے جس کی تصدیق عالم کا ذرّہ ذرّہ کرتا ہے جس پر نظام تمام دنیا قائم ہے۔

قرآن شریف میں اس مسئلہ کو ایک عمدہ مثال میں بیان کیا ہے جو ذیل میں معہ ایک لطیف تحقیقات جو اس کی تفسیر سے متعلق اور بحث ہٰذا کی تکمیل کے لئے ضروری ہے لکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (النور: 36)

خدا آسمان و زمین کا نور ہے۔ یعنے ہر ایک نور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے۔ خواہ وہ ارواح میں ہے۔ خواہ اجسام میں اور خواہ ذاتی ہے اور خواہ عرضی اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ باطنی اور خواہ ذہنی ہے خواہ خارجی۔ اسی کے فیض کا

عطیہ ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ربّ العالمین کا فیض عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے اور کوئی اس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے اور تمام انوار کا علت العلل اور تمام رحمتوں کا سر چشمہ ہے۔ اُسی کی ہستیٔ حقیقی تمام عالم کی قیوم اور تمام زیر وزبر کی پناہ ہے۔ وہی ہے جس نے ہر یک چیز کو ظلمت خانۂ عدم سے باہر نکالا اور خلعت وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حد ذاتہ واجب اور قدیم ہو۔ یا اس سے مستفیض نہ ہو بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور روح اور جسم سب اُسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ میں ظاہر فرمایا گیا۔ یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر یک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائض ہونے کے لئے کوئی قابلیت شرط نہیں۔

لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے جو مشروط بشرائط ہے اور انہیں افراد خاصہ پر فائض ہوتا ہے جن میں اس کے قبول کرنے کی قابلیت واستعداد موجود ہے۔ یعنی نفوس کاملہ انبیاء علیہم السلام پر جن میں سے افضل واعلیٰ ذات جامع البرکات حضرت **محمد** مصطفیٰ ﷺ ہے دوسروں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائق حکمیہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اوّل فیضان عام کو (جو بدیہی الظہور ہے) بیان کر کے پھر اس فیضان خاص کو بغرض اظہار کیفیت نور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اس آیت سے شروع ہوتی ہے۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔ الخ۔ اور بطور مثال اس لئے بیان کیا کہ تا اس دقیقۂ نازک کے سمجھنے میں ابہام اور دقت باقی نہ رہے۔ کیونکہ معانی معقولہ کو صُوَرِ محسوسہ میں بیان کرنے سے ہر یک غبی وبلید بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ بقیہ ترجمہ آیات ممدوحہ یہ ہے۔

اس نور کی مثال (فرد کامل میں جو پیغمبر ہے) **یہ ہے جیسے ایک طاق** (یعنے سینۂ مشروح حضرت پیغمبر خدا ﷺ) **اور طاق میں ایک چراغ** (یعنے وحی اللہ) **اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں جو نہایت مصفیٰ ہے۔** (یعنے نہایت پاک اور مقدس دل میں جو آنحضرت ﷺ کا دل ہے جو کہ اپنی اصل فطرت میں شیشہ سفید اور صافی کی طرح ہر یک طور کی کثافت اور کدورت سے مُنزّہ اور مطہر ہے۔ اور تعلقات ماسوی اللہ سے بکلی پاک ہے) **اور شیشہ ایسا صاف کہ گویا ان ستاروں میں سے ایک عظیم النور ستارہ ہے جو کہ آسمان پر بڑی آب وتاب کے ساتھ چمکتے ہوئے نکلتے ہیں جن کو کوکب دُرّی کہتے ہیں** (یعنے حضرت خاتم الانبیاءؐ کا دل ایسا صاف کہ کوکب دُرّی کی طرح نہایت منور اور درخشندہ جس کی اندرونی روشنی اس کے بیرونی قالب پر پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے) **وہ چراغ زیتون کے شجرۂ مبارکہ سے** (یعنی زیتون کے روغن سے) **روشن کیا**

گیا ہے (شجرۂ مبارکہ زیتون سے مراد وجودِ مبارک محمدیؐ ہے کہ جو بوجہ نہایت جامعیت و کمال انواع و اقسام کی برکتوں کا مجموعہ ہے جس کا فیض کسی جہت و مکان و زمان سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام لوگوں کے لئے عام علیٰ سبیل الدوام ہے اور ہمیشہ جاری ہے کبھی منقطع نہیں ہو گا) **اور شجرۂ مبارکہ نہ شرقی ہے نہ غربی** (یعنے طینت پاک محمدیؐ میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ نہایت توسط و اعتدال پر واقع ہے اور احسن تقویم پر مخلوق ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ اس شجرۂ مبارکہ کے روغن سے چراغِ وحی روشن کیا گیا ہے۔ سو روغن سے مراد عقل لطیف نورانی محمدی معہ جمیع اخلاق فاضلہ فطرتیہ ہے جو اس عقل کامل کے چشمۂ صافی سے پروردہ ہیں۔ اور وحی کا چراغ لطائف محمدیّہ سے روشن ہونا ان معنوں کرکے ہے کہ ان لطائف قابلہ پر وحی کا فیضان ہوا اور ظہور وحی کا موجب وہی ٹھہرے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ فیضانِ وحی ان لطائف محمدیّہ کے مطابق ہوا۔ اور انہیں اعتدالات کے مناسب حال ظہور میں آیا کہ جو طینت محمدیہؐ میں موجود تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہریک وحی نبیٔ منزل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی۔ سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج بغایت درجہ وضع استقامت پر واقعہ تھا نہ ہر جگہ حلم پسند تھا اور نہ ہر مقام غضب مرغوب خاطر تھا۔ بلکہ حکیمانہ طور پر رعایت محل اور موقعہ کی ملحوظ طبیعت مبارک تھی۔ سو قرآن شریف بھی اسی طرز موزون و معتدل پر نازل ہوا کہ جامع شدت و رحمت و ہیبت و شفقت و نرمی و درشتی ہے۔ سو اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا کہ چراغِ وحی فرقان اس شجرۂ مبارکہ سے روشن کیا گیا ہے کہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

یعنے طینت معتدلہ محمدیہ کے موافق نازل ہوا ہے جس میں نہ مزاج موسوی کی طرح درشتی ہے۔ نہ مزاج عیسوی کی مانند نرمی۔ بلکہ درشتی اور نرمی اور قہر اور لطف کا جامع ہے۔ اور مظہر کمال اعتدال اور جامع بین الجلال والجمال ہے اور اخلاق معتدلہ فاضلہ آنحضرت ﷺ کہ جو بمعیت عقل لطیف روغن ظہور روشنیٔ وحی قرار پائی۔ اُن کی نسبت ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے اور وہ یہ ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔(القلم: 5) یعنے تو اے نبیؐ ایک خلق عظیم پر مخلوق و مفطور ہے یعنے اپنی ذات میں تمام مکارم اخلاق کا ایسا متمم و مکمل ہے کہ اس پر زیادت متصور نہیں کیونکہ لفظ عظیم محاورۂ عرب میں اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔

مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس قدر طول و عرض درخت میں ہو سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ

ادراک سے باہر ہو۔ اور خلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حسنِ اختلاط یا نرمی و تلطف و ملائمت (جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے بلکہ خَلق بفتح خا اور خُلق بضم خا دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقعہ ہیں۔

خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورت ظاہری ہے جو انسان کو حضرت واہب الصور کی طرف سے عطا ہوئی۔ جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیز ہے۔

اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورت باطنی یعنے خواص اندرونی ہیں جن کی رو سے حقیقت انسانیہ حقیقت حیوانیہ سے امتیاز کلی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرہ انسانیت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں۔ اُن سب کا نام خُلق ہے۔ اور چونکہ شجرۂ فطرتِ انسانی اصل میں توسط اور اعتدال پر واقعہ ہے۔ اور ہریک افراط و تفریط سے جو قویٰ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزّہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔(التین: 5) اس لئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمت کی قید کے بغیر بولا جائے ہمیشہ اخلاق فاضلہ مراد ہوتے ہیں۔ اور وہ اخلاق فاضلہ جو حقیقت انسانیہ ہے۔ تمام وہ خواص اندرونی ہیں جو نفس ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں جیسے عقل ذکا۔ سرعتِ فہم۔ صفائی ذہن۔ حسنِ تحفظ۔ حسنِ تذکر۔ عفت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورع۔ جوانمردی۔ استقلال۔ عدل۔ امانت۔ صدق لہجہ۔ سخاوت فی محلہ۔ ایثار فی محلہ۔ کرم فی محلہ۔ مروت فی محلہ۔ شجاعت فی محلہ۔ علوہمت فی محلہ۔ حلم فی محلہ۔ تحمل فی محلہ۔ حمیت فی محلہ۔ تواضع فی محلہ۔ ادب فی محلہ۔ شفقت فی محلہ۔ رافت فی محلہ۔ رحمت فی محلہ۔ خوف الٰہی۔ محبت الٰہیہ۔ انس باللہ۔ انقطاع الی اللہ وغیرہ وغیرہ) **اور تیل ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ** (یعنے عقل اور جمیع اخلاق فاضلہ اس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیت و لطافت و نورانیت پر واقعہ کہ الہام سے پہلے ہی خودبخود روشن ہونے پر مستعد تھے) **نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔ نور فائض ہوا نور پر** یعنے جب کہ وجودِ مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے۔ سو اُن نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحیٔ الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اس نور کے وارد ہونے سے وجود باجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔"

("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 191 تا 195 حاشیہ)

❁ پھر وسوسہ پنجم: "بعض برہمو سماج والے یہ وسوسہ پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر کامل معرفت قرآن پر ہی موقوف ہے تو پھر خدا نے اس کو تمام ملکوں میں اور تمام معمورات قدیم و جدید میں کیوں شائع نہ کیا اور کیوں کروڑہا مخلوقات کو اپنی

معرفت کاملہ اور اعتقاد صحیح سے محروم رکھا۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 198 حاشیہ) اس کے جواب میں مختلف انسانی طبائع اور قوتوں کی حکمت کا بیان ہے۔

❁ پھر چھٹے وسوسہ: "معرفت کامل کا ذریعہ وہ چیز ہو سکتی ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں کھلے طور پر نظر آتی ہو۔ سو یہ صحیفہ نیچر کی خاصیت ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا اور ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور یہی رہبر ہونے کے لائق ہے۔ کیونکہ ایسی چیز کبھی رہنما نہیں ہو سکتی جس کا دروازہ اکثر اوقات بند رہتا ہو اور کسی خاص زمانہ میں کھلتا ہو۔" کا جواب ہے۔

("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 207 حاشیہ)

❁ پھر ساتویں وسوسہ: "کسی کتاب پر علم الٰہی کی ساری صداقتیں ختم نہیں ہو سکتیں پھر کیونکر امید کی جائے کہ ناقص کتابیں کامل معرفت تک پہنچا دیں گی۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 223 حاشیہ) کا جواب ہے۔

❁ پھر اس آٹھویں وسوسہ کا جواب دیا کہ یہ ایک فضول سا وسوسہ اور اعتراض ہے کہ: "انسان کو خدا کا ہم کلام تجویز کرنا ادب سے دور ہے۔ فانی کو ذاتِ ازلی ابدی سے کیا نسبت اور مشت خاک کو نورِ وجوب سے کیا مشابہت۔"

("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 230، 231 حاشیہ)

❁ پھر وسوسہ نہم ہے کہ جس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ وسوسہ یا خیال یا اعتراض یہ تھا کہ: "یہ اعتقاد کہ خدا آسمان سے اپنا کلام نازل کرتا ہے یہ بالکل درست نہیں کیونکہ قوانین نیچر یہ اس کی تصدیق نہیں کرتے اور کوئی آواز اوپر سے نیچے کو آتی ہم کبھی نہیں سنتے۔ بلکہ الہام صرف ان خیالات کا نام ہے کہ جو فکر اور نظر کے استعمال سے عقلمند لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں و بس۔" ("براہین احمدیہ حصہ سوم" روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 232 حاشیہ)

❁ اس ضمن میں آپ نے دنیا بھر کے لوگوں کو یہ چیلنج دیا کہ وہ الہام الٰہی جس کا بیان ہوا ہے وہ محض ایک ماضی کا قصہ نہیں ہے۔ وہ اب بھی امت محمدیہ کے کامل افراد کے ذریعہ جاری ہے اور فرمایا اس کا ثبوت میں دوں گا۔ کوئی بھی مقابلہ کے لئے سامنے آئے۔ اور یہ وہ عظیم الشان بات تھی اور چیلنج تھا کہ جو آپ کے سوا اور کسی نے نہیں دیا۔

اسی ضمن میں مولوی عبد اللہ قصوری صاحب کا ایک رسالہ جو حضور علیہ السلام کی نظر سے گزرا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ گویا مولوی صاحب موصوف اولیاء وغیرہ کے الہام سے منکر ہیں تو آپ نے ان کی تسلی و تشفی کے لئے بڑی تفصیل سے ان کے اس شک کو دور فرمایا بلکہ اس ضمن میں اپنے الہامات اور رؤیا و کشوف کا بھی ذکر فرمایا۔ اور الہام کی مختلف صورتوں کا بھی بیان فرمایا۔

❁❁❁❁❁

اسلام کی تعلیم کا بنیادی کمال

قسط اوّل:

اعتدال وحکمت

(سیّد میر محمود احمد ناصر)

اسلام کی تعلیم کا ایک بنیادی کمال اس کے احکامات میں اعتدال ہے۔

(1) حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام فرماتے ہیں:

”انسانی قویٰ کی تمام شاخوں میں سے صرف ایک شاخ حلم اور درگزر پر انجیل کی تعلیم زور دیتی ہے اور باقی شاخوں کا خون کیا ہے۔ حالانکہ ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو کچھ انسان کو قدرتِ قادر نے عطا کیا ہے کوئی چیز اس میں سے بیکار نہیں ہے۔ اور ہر ایک انسانی قوت اپنی اپنی جگہ پر عین مصلحت سے پیدا کی گئی ہے۔ اور جیسے کسی وقت اور کسی محل پر حلم اور درگزر عمدہ اخلاق میں سے سمجھے جاتے ہیں ایسا ہی کسی وقت غیرت اور انتقام اور مجرم کو سزا دینا اخلاق فاضلہ میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ نہ ہمیشہ درگزر اور عفو قرین مصلحت ہے اور نہ ہمیشہ سزا۔ اور انتقام مصلحت کے مطابق ہے یہی قرآنی تعلیم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۔(الشوریٰ:41) یعنی بدی کی جزا اسی قدر ہے جس قدر بدی کی گئی۔ مگر جو کوئی عفو کرے اور اس عفو میں کوئی اصلاح مقصود ہو تو اس کا اجر خدا کے پاس ہے۔“ (”چشمہ مسیحی“ روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 345،346)

پھر فرماتے ہیں:

”قرآن شریف نے بے فائدہ عفو اور درگزر کو جائز نہیں رکھا۔ کیونکہ اس سے انسانی اخلاق بگڑتے ہیں اور شیرازہ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ اس عفو کی اجازت دی ہے جس سے کوئی اصلاح ہو سکے۔“
(”چشمہ مسیحی“ روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 346 حاشیہ)

یہ ایک مثال اس بات کی ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم کس طرح حکیمانہ اعتدال پر قائم ہے۔ آج جو پرانا عہد نامہ ہمارے سامنے ہے اس میں انتقام اور سختی پر غیر معمولی زور ہے اور نئے عہد نامہ میں عفو اور درگذر کرنے پر جو مصلحت کے

خلاف ہو زور دیا گیا ہے۔ **قرآن شریف نے حکمت اور اعتدال کی تعلیم دی ہے۔**

(2) اور یہ صرف ایک مثال نہیں بلکہ قرآنی احکامات سراسر اعتدال اور حکمت پر مبنی ہیں۔ قرآن اپنے ماننے والوں کو فرماتا ہے کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا مگر ساتھ ہی تاکید فرماتا ہے وَلَا تُسۡرِفُوۡا کہ کھاؤ پیو ضرور **مگر اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔**

حضرت بانئ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دلی قوتوں پر ضرور اثر ہے۔ مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہئے کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے رفتہ رفتہ ان کی شجاعت کی قوت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نہایت بزدل ہو جاتے ہیں اور ایک خداداد اور قابل تعریف قوت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی شہادت خدا کے قانون قدرت سے اس طرح پر بھی ملتی ہے کہ چارپایوں میں سے جس قدر گھاس خور جانور ہیں کوئی بھی ان میں سے وہ شجاعت نہیں رکھتا جو ایک گوشت خور جانور رکھتا ہے۔ پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ ہوتی ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے۔ ہاں جو لوگ دن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتی غذاؤں سے بہت ہی کم حصہ رکھتے ہیں وہ بھی حلم اور انکسار کے خلق میں کم ہو جاتے ہیں اور میانہ روش کو اختیار کرنے والے دونوں خلق کے وارث ہوتے ہیں۔ اسی حکمت کے لحاظ سے خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا۔(الاعراف: 32)

یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دوسری چیزیں بھی کھاؤ مگر کسی چیز کی حد سے زیادہ کثرت نہ کرو تا اس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے اور تا یہ کثرت مضر صحت بھی نہ ہو۔''

(''اسلامی اصول کی فلاسفی'' روحانی خزائن جلد 10 صفحہ 320)

اسلامی تعلیم میں عبادت پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے اور انسانی تخلیق کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار دیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا: مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ۔(الذاریات: 57) مگر عبادت کے پورے آداب و احکامات سرانجام دیتے ہوئے بھی مسلمانوں کو یہ حکم نہیں کہ وہ عبادت کی ظاہری شکل کو اس شدت کے ساتھ ادا کریں کہ جو تکلیف مَا لَا یُطَاق بن جائے یا اپنے نفس کے حقوق اور اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور عام انسانوں کے حقوق ادا کر سکیں۔

حضرت بانئ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پیدا ہوا ہے جیسا کہ فرمایا مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا

لِیَعۡبُدُوۡنِ۔(الذاریات: 57)اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہوا ہے... تم اس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے پیدا کرنے سے خدا تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے لئے بن جاؤ دنیا تمہاری مقصود بالذات نہ ہو۔ میں اس لئے بار بار اس ایک امر کو بیان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی ایک بات ہے جس کے لئے انسان آیا ہے اور یہی بات ہے جس سے وہ دور پڑا ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دنیا کے کاروبار چھوڑ دو، بیوی بچوں سے الگ ہو کر کسی جنگل یا پہاڑ میں جا بیٹھو۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا اور رہبانیت اسلام کا منشاء نہیں۔ اسلام تو انسان کو چست اور ہوشیار اور مستعد بنانا چاہتا ہے اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو جدوجہد سے کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس کے پاس زمین ہو اور وہ اس کا تردّد نہ کرے تو اس سے مواخذہ ہو گا۔ پس اگر کوئی اس سے یہ مراد لے کہ دنیا کے کاروبار سے الگ ہو جائے وہ غلطی کرتا ہے۔ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کاروبار جو تم کرتے ہو اس میں دیکھ لو کہ خدا تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور اس کے ارادہ سے باہر نکل کر اپنی اغراض اور جذبات کو مقدّم نہ کرے۔"

("ملفوظات" حضرت اقدس مسیح موعودؑ جلد1 صفحہ168 تا170 ایڈیشن2022ء)

(3) **دو قوموں میں اگر کسی وجہ سے جنگ کی صورت پیدا ہو** تو بالعموم اعتدال اور حکمت کو چھوڑ کر ہر ایک قوم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ فریق مخالف کو جس طرح بھی ہو سکے پوری طرح Crush کر کے رکھ دے۔ قرآن شریف نے اگرچہ اپنے دفاع کی پوری طرح اجازت دی ہے مگر نہ کسی قسم کی جارحیت کی اجازت دی ہے اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ حملہ آور قوم اگر صلح کے لئے پہلو جھکائے تب بھی اس سے صلح نہ کی جائے اور مد مقابل کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۔(الانفال: 62) کہ اگر فریق مخالف جس نے جارحانہ جنگ کی ابتدا کی ہے صلح کی طرف مائل ہو تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر توکل کرو۔ فرماتا ہے وَ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ۔(الانفال: 63) خواہ (ان کی صلح کا جھکاؤ) اس لئے ہو کہ وہ تمہیں دھوکہ دیں تب بھی صلح کرو اور اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ فرماتا ہے کہ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَ تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۔(المائدہ: 3) کہ ایک قوم کی تمہارے ساتھ یہ عداوت کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کے کام میں تعاون کرو۔ پھر فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۖ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۗ هُوَ اَقۡرَبُ

لِلتَّقْوٰی۔(المائدہ: 9) اے مومنوں تم انصاف کے ساتھ گواہی دیتے ہوئے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہر گز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو تم انصاف کرو وہ تقویٰ کے قریب ترین ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ یقیناً اس کو خوب جانتا ہے۔

(4) **قرآن شریف نے اعتدال وحکمت کو شریعت کے احکامات کی تعمیل کے ضمن میں لازمی قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے** لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔(البقرہ: 287) کہ اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔

خدا تعالیٰ رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتا ہے فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔(البقرہ: 185) کہ تم سے جو بھی مریض ہو یا سفر پر ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اتنی مدّت کے روزے دوسرے ایّام میں پورے کرے۔ اور اس حکم کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔(البقرہ: 186) کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔

اسی طرح حج کو بنیادی ارکان اسلام میں قرار دیا ہے مگر فرماتا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔(ال عمران: 98) کہ یہ اس شخص پر فرض ہے جو مال یا صحت یا راستہ کے امن کے لحاظ سے استطاعت رکھتا ہو۔

انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید فرماتا ہے مگر لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔(البقرہ: 196) کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

روزہ کے متعلق تاکید فرماتا ہے کہ اس کی پابندیاں اس کے وقت کے لئے ہیں سورج ڈوبنے کے بعد کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات پر پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اپنی جان پر ناواجب بوجھ ڈالنے کی اجازت نہیں۔

حرم کے علاقے میں شکار کی پابندی ہے کیونکہ وہ علاقہ مقدس اور قابل احترام ہے مگر موذی جانور اس پابندی سے مستثناء ہیں۔ حرم کے علاقہ میں درختوں، پودوں وغیرہ کو کاٹنا منع ہے مگر حقیقی ضروریات کے لئے اَذْخَر گھاس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ بعض چیزوں کے کھانے پینے کی ممانعت ہے مگر اضطرار اور بیماری کی صورت میں ان کا استعمال جائز ہے۔

بیویوں سے انتہائی حسن سلوک کا حکم ہے مگر باغیانہ رویہ اور جنسی بے راہ روی کی صورت میں ذرائع تادیب محدود طور پر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اچھے حالات میں چار شادیوں کی اجازت ہے مگر عدل وانصاف کو خطرہ ہو تو ایک شادی سے زیادہ کی اجازت نہیں۔

طلاق انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے مگر مجبوریوں کی صورت میں جائز بھی ہے۔ ایک شخص کو 100 سوٹیوں کی سزا تھی

مگر اس کی صحت اور جسمانی حالت اس سزا کے نتیجہ میں خطرناک ہو سکتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سزا کی تنفیذ اس طرح کروائی کہ 100 تنکوں کا ایک گٹھا بنا کر اس کو ایک دفعہ مارنے کا ارشاد فرمایا۔

نماز میں قیام ایک اہم رکن ہے مگر بیمار یا ضعیف بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ نماز کے لئے وضوء کا حکم ہے لیکن اگر وضوء کے لئے پانی میسر نہ ہو یا پانی کے استعمال میں روک ہو تو تیمم بھی کیا جا سکتا ہے۔

کھانے کے لئے حلال جانور ذبح کرنے کی اجازت ہے مگر ذبح کا سامان ایسا ہونا چاہیئے جو تیز ہو اور ذبح کرتے وقت کم سے کم تکلیف کا باعث ہو۔

قرآن شریف کی کثرت سے تلاوت پر زور ہے مگر اس رنگ میں تلاوت کہ تین دن میں سارا قرآن جلدی جلدی پڑھ لیا جائے اور تدبر نہ کیا جائے منع ہے۔

اللہ کے راستہ میں، رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے انفاق کی تاکید ہے مگر وَ اٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِيۡلِ کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِيۡرًا۔(بنی اسرائیل: 27) مال کو بے جا خرچ کر کے ضائع نہ کرو۔

زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشش اور تدبیر کا حکم ہے مگر ان پر توکل کے بجائے خدا تعالیٰ پر توکل کا حکم ہے۔ نماز باجماعت کے لئے مسجد میں آنے کا حکم ہے مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے صَلُّوۡا فِيۡ رِحَالِكُمۡ۔(صحیح بخاری، کتاب الاذان باب الاذان للمسافر ... حدیث: 632) اپنے ٹھکانوں میں نماز پڑھ لو۔ کا ارشاد بھی ہے نماز باجماعت کے لئے پہلے وقت آنے کا حکم ہے مگر نماز کھڑی ہو گئی ہو تو اس کے لئے جلدی کر کے بھاگ کر آنا اور بھگدڑ ڈالنا منع ہے۔

ماں باپ کی اطاعت اور احترام پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے لیکن اگر ماں باپ شرک کی تعلیم دیں تو ان کی اطاعت کی اجازت نہیں۔

انسانی ذہن کو سمجھانے کے لئے صفات باری تعالیٰ کو تشبیہی رنگ میں بیان کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ۔(الشوریٰ: 12) کہہ کر تنزیہی صفات کی طرف بھی توجہ دلا دی ہے۔ انبیاء اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ان معنوں میں واسطہ ہیں کہ وہ اللہ کا پیغام صحیح صحیح بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس لئے انبیاء کو ماننا اللہ کو ماننے کے لئے ضروری ہے مگر لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی۔(بنی اسرائیل: 16) کہہ کر اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا گیا ہے کہ چرچ کے عقیدہ کی طرح انبیاء بندوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں۔ قرآن یہ بھی ارشاد فرماتا ہے کہ قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کلام انبیاء پر نازل

ہوتا رہا ہے اور قرآن سے پہلے الہامی صحائف بھی موجود تھے مگر ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرماتا ہے کہ یہ صحائف محفوظ نہیں رہے اور لوگوں نے اپنی طرف سے باتیں لکھ کر ان کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔ بعض لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ finite انسان کس طرح infinite خالق کائنات تک پہنچ سکتا ہے مگر قرآن کہتا ہے بے شک لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ کہ آنکھیں اس کو پا نہیں سکتیں وَھُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ۔(الانعام: 104)اور وہ آنکھوں تک پہنچتا ہے۔

قرآن شریف ہر ایک قسم کی برائی سے بدی سے بڑی سختی کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو منع کرتا ہے لیکن اگر کسی سے برائی سرزد ہو جائے تو اس کو مایوس نہیں کرتا بلکہ فرماتا ہے مَنۡ عَمِلَ مِنۡکُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۔(الانعام: 55) کہ تم میں سے کوئی جہالت سے بدی کا ارتکاب کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو یاد رکھے کہ اللہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

قرآن اگرچہ تاکید کرتا ہے کہ اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔(الانعام: 107) کہ تم اس کی پیروی کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر یہ نہیں کہتا ہے کہ جو خدائے واحد برحق کو معبود قرار نہیں دیتے ان پر حملہ کرو یا ان کو دکھ دو بلکہ فرماتا ہے وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ کہ شرک کرنے والوں سے اعراض کرو۔ فرماتا ہے وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ۔(الانعام: 108) کہ تم ان پر نگران نہیں ہو۔

جہاں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ اس ذبیحہ کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو وہاں اس بارہ میں بے جا اور بے ضرورت وہم سے بھی منع کیا گیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کی کہ ہمارے پاس لوگ گوشت لاتے ہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پر بسم اللہ پڑھی گئی تھی یا نہیں تو فرمایا تم اس پر بسم اللہ پڑھ کر کھا لیا کرو۔ مشرکوں نے یہ بات بنائی ہوئی تھی کہ اِن جانوروں کا گوشت صرف مرد کھائیں گے اگر مردار ہو تو مرد عورت سب کھائیں گے تو اس قسم کی بے حکمت باتوں سے قرآن کلیۃً منع فرماتا ہے۔ قرآن میں یہ اعتدال اور حکمت بھی پائی جاتی ہے کہ نیکی کا بدلہ دس گنا اور برائی کی سزا صرف اتنی ہے جتنی برائی کی گئی۔ فرماتا ہے: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَہَا۔(الانعام: 161)

قرآن مجید نے کھانے کی چیزوں میں سے چار چیزوں کو بنیادی طور پر حرام قرار دیا ہے ایک مَیۡتَۃً جو جسمانی طور پر مضرّ ہے۔ دوسرے دَمًا مَّسۡفُوۡحًا جو ذہنی لحاظ سے مضر ہے۔ تیسرے لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ جو اخلاقی لحاظ سے مضر ہے چوتھے فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ جو روحانی لحاظ سے مضرّ ہے۔ مگر فرمایا فَمَنِ اضۡطُرَّ جو مجبور ہو جائے غَیۡرَ بَاغٍ مگر خواہش نہ رکھتا ہو وَّلَا عَادٍ

اور نہ حدّ سے تجاوز کرنے والا ہو فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔(الانعام: 146)تو تیرا ربّ بہت بخشنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو زینت کا سامان اپنے بندوں کے لئے نکالا ہے اور رزق کی پاکیزہ چیزیں وہ حرام نہیں ہیں۔ تم کہو میرے ربّ نے مخفی اور کھلی بے حیائیاں اور ناحق بغاوت اور شرک حرام کیا ہے فرماتا ہے اے بنی آدم جو رسول تمہارے پاس آئیں ان پر ایمان لانے والے خوف و حزن سے محفوظ رہیں گے اور ان کو تکبّر کے ساتھ جھٹلانے والے سزا کے مستحق ہونگے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ اپنے ربّ سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرو جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ فرماتا ہے زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو بلکہ ڈر اور امید کے ساتھ اس سے دعا کرو کیونکہ یہ نیکی کرنے والوں کے لئے اللہ کی رحمت قریب ہے۔ فرماتا ہے اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کرو کیونکہ یہ تذکرہ کامیابی کا ذریعہ ہے۔ فرماتا ہے ماپ اور تول پورا پورا کرو ایسا نہ کرنا زمین میں اصلاح کے بعد فساد پھیلانے کے مترادف ہے۔ راستوں پر بیٹھ کر لوگوں کے لئے خطرہ نہ بنو اور ان کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے نہ روکو۔

قرآن شریف بار بار بُرے کام کرنے والوں کو انذار بھی کرتا ہے مگر یہ بھی فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا کہ وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کیں پھر توبہ کرلی اور ایمان لے آئے اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔(الاعراف: 154) تو یقیناً تیرا ربّ اس کے بعد بھی بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اللہ کے خوبصورت نام ہیں۔ قرآن فرماتا ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کہ اللہ کو ان ناموں سے پکارو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان ناموں کو بگاڑنے والوں کو تہ تیغ کرو مگر قرآن اسی آیت میں فرماتا ہے وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ۔(الاعراف: 181) کہ جو اس کے ناموں کو بگاڑتے ہیں ان کو چھوڑ دو۔

امّت مسلمہ میں کچھ لوگ اس بات کے مدّعی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب ماننا ضروری ہے مگر قرآن شریف آپؐ کی زبان مبارک سے کہلواتا ہے: لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۖۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ کہ اگر میں غیب جاننے والا ہوتا تو میں بہت خیر اکٹھی کرلیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ چھوتی۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔(الاعراف: 189) لیکن میں تو محض ایک ڈرانے والا اور ایک خوش خبری دینے والا ہوں۔ اس قوم کے لئے جو ایمان لاتی ہے۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ مومنوں کو تکلیف ہو سکتی ہے۔ لیکن فرماتا ہے: وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ ۔کہ اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اللہ کی پناہ مانگ لو اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔(الاعراف: 201) وہ بہت سننے والا اور دائمی علم رکھنے والا ہے۔ بعض دفعہ مخالفین مامور اور اس کو ماننے والوں سے

نشان دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں فرماتا ہے کہ جب تم ان کے پاس نشان نہیں لاتے تو کہتے ہیں کیوں نہ تم اسے چُن کر لائے۔ فرماتا ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ۔(الاعراف: 204)تم کہو(میں خود کچھ نہیں کرتا) میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ یہ اس لئے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ اپنے ربّ کو اپنے نفس میں گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور اونچی آواز کئے بغیر صبح اور شام یاد کرو اگر ایسا نہ کروگے تو تم غافل قرار پاؤ گے۔

انفال یعنی غنیمتوں کے متعلق پوچھنے کو قرآن فرماتا ہے کہ ان کا تعلق اللہ اور رسولؐ سے ہے۔ اصل چیز غنائم نہیں بلکہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ اصل چیز اللہ کا تقویٰ اور باہمی صلح اور امن ہے جس کا ذریعہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗٓ۔(الانفال: 2)اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔(الانفال: 3) مومنوں کا اصل کام غنیمتوں کا حصول نہیں بلکہ اللہ کے ذکر پر خوف اور اللہ کی آیات سے ایمان میں زیادتی اور اپنے رب پر توکل اور بشرائط نماز کی ادائیگی اور انفاق فی سبیل اللہ ہے اور جارحانہ طور پر حملہ آور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدمی ہے اور یہ بات اللہ اور اس کے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہنے سے ملے گا۔ اگر یہ مقام تمہیں حاصل ہو گیا تو پھر یاد رکھو کہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسولؐ کے سپرد معاشرے کے مستحق طبقات پر خرچ کرنے کے لئے ہے۔

قرآن مجید مومنوں کو حکم فرماتا ہے کہ اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو اور تم اس میں کامیابی چاہتے ہو تو وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔(الانفال: 46)اللہ کا بہت ذکر کرو وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ وَلَا تَنَازَعُوْا۔(الانفال: 47)اور آپس میں مت جھگڑو۔

(5)　قرآن مومنوں کو دین کی خدمت کے سلسلہ میں پوری سرگرمی کا ارشاد فرماتا ہے مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرماتا ہے وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ۔(الانفال: 48) کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر نکلے۔

(6)　عہد کی پابندی کی قرآن شریف نے خاص تاکید فرمائی ہے اور اس پر اس حد تک زور دیا ہے کہ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کے ساتھ عہد شکنی کا ڈر ہو فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔(الانفال: 59)تو یہ عہد ان کو برابری کی سطح پر واپس کرنا(یعنی کسی ایسے وقت عہد واپس نہ کرنا جب تم مضبوط ہو اور وہ کمزور ہوں اور اپنی طاقت اور ان کی

کمزوری کی بناء پر تم یہ عہد ختم کرو) یقیناً اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(7) اور تم اپنے دشمن (جو تم پر جارحانہ حملہ کرتا ہے) کے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیاری کرو لیکن وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو تو تمہارا بھی فرض ہے کہ صلح کی طرف جھکو (اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو) اللہ پر بھروسہ کرو اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۔(الانفال: 62) یقیناً وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ وَ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ اگر وہ تمہیں دھوکہ دینا چاہتے ہیں فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ هُوَ الَّذِيۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۔(الانفال: 63) وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مومنوں کے ذریعہ تمہاری تائید فرمائی ہے۔

(8) فردی آزادی کی اہمیت کو قرآن شریف نے اس رنگ میں بھی بیان فرمایا ہے کہ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ ۔(الانفال: 68) کہ ایک نبی کو بھی اجازت نہیں کہ اس کے لئے قیدی ہوں سوائے اس کے اسے زمین میں خونریز جنگ لڑنا پڑے۔ اور ان قیدیوں کو بھی کہو اِنۡ يَّعۡلَمِ اللّٰهُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ خَيۡرًا يُّؤۡتِكُمۡ خَيۡرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنۡكُمۡ ۔(الانفال: 71) کہ اگر تمہارے دل میں بھلائی ہو گی تو اللہ تمہیں وہ بھلائی جو تم سے لے لی گئی ہے (یعنی آزادی) وہ تمہیں یہ بھلائی دے دے گا اور تمہاری غلطیاں معاف کر دے گا۔

(9) قرآن شریف فرماتا ہے کہ مومنوں کے ذمہ ان کی حفاظت کی ذمہ واری ہے جو ہجرت کر کے مومنوں کے علاقہ میں آگئے ہیں مگر جو مسلمانوں کے علاقہ میں نہیں آئے ان کی مدد اور حفاظت مسلمانوں کی ذمہ واری نہیں ہے ہاں اگر وہ باہر کے مسلمان مدد چاہیں تو ان کی مدد کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جن سے تمہارا معاہدہ ہے۔

(10) قرآن شریف جارحانہ حملہ کی قطعاً اجازت نہیں دیتا صرف دفاعی جنگ کی اجازت دیتا ہے مگر دفاعی جنگ کے دوران میں اگر دشمن پناہ مانگتا ہے تو نہ صرف اسے پناہ دینا ضروری ہے تاکہ وہ کلام الٰہی سنے (اور شاید دشمنی چھوڑ دے) بلکہ اسے واپس اس کے امن کی جگہ پہنچانا بھی مسلمانوں کی ذمہ واری ہے ایسے دشمن سے جس نے حملہ کیا ہو اس قسم کا ہمدردانہ سلوک بہت بلند پایہ اخلاق میں سے ہے۔

(11) قرآن شریف نے عہد کی پابندی کی سختی سے تاکید فرمائی ہے لیکن بعض لوگ عہد کر کے بار بار توڑتے اور جب بھی موقعہ ملتا نہ کسی عہد کا پاس کرتے نہ کسی ذمہ واری کا۔ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَ طَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَٮِٕمَّةَ الۡكُفۡرِ ۔(التوبۃ: 12) کہہ کر ایسے لوگوں سے لڑائی کی اجازت دی ہے اور فرماتا ہے کیا تم ایسی قوم سے

لڑائی نہیں کروگے جو اپنی قسمیں توڑ بیٹھے ہیں اور رسولؐ کو نکال دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور وہی ہیں جنہوں نے تم سے جنگ کی ابتدا کی کیا تم ان سے ڈر جاؤ گے؟ پس اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

(12) اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں والدین اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کی تاکید فرماتا ہے لیکن اگر آباء و اجداد اور رشتہ دار ایمان کے بجائے کفر سے محبت کریں تو (ان سے حسن سلوک الگ بات ہے) ان کو دلی اور قلبی دوست بنانا درست نہیں۔

(13) جب امام کی طرف سے تمہیں خدا کی راہ میں نکلنے کا ارشاد ہو اور تم (نعوذ باللہ) اس ارشاد کی تعمیل نہ کرو تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔(التوبة: 39) اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا جو اپنے فرائض ادا کرے گی۔ اگر تم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کے لئے کمربستہ نہیں ہوگے تو اللہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں اس کا فائدہ تمہیں ہی ہے اللہ نے تو ان کی مدد اس وقت بھی کی تھی جب وہ غار میں صرف ایک ساتھی کے ساتھ تھے۔

(14) جہاں قرآن مجید نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے اور جارحانہ دشمن کے حملے کے مقابلہ کے لئے اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ۔(الانفال:61) کہہ کر پوری تیاری کی تاکید فرمائی ہے وہاں ساز و سامان کی کمی اور سفر وغیرہ کی مشکلات کو ان کے رستے میں روک کا بہانہ بنانے کی اجازت بھی نہیں دی جیسا کہ فرماتا ہے: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ...... لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ...... وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً......۔(التوبة: 41تا46)

(15) سورۃ التوبہ میں صدقات وزکوٰۃ کے مصارف کی تقسیم کا ایسا جامع حکم دیا ہے جو حقیقی ضروریات کے لحاظ سے بھی بابرکت ہے اور معاشرہ کے طبقات میں بے جا کش مکش کو بھی روکنے کا باعث ہے۔

(16) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ۔(التوبة: 66) فرما کر جھوٹے عذر بنا کر دینی اور جماعتی ذمہ واریوں سے بچنے والوں کو شدید تنبیہہ کی گئی ہے۔

(17) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (التوبة: 73) میں کفار اور منافقین کے جارحانہ حملوں اور شرارتوں کا مضبوطی سے مقابلہ کرنے کی تاکید اس لئے کی گئی ہے وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے ان کو جہنم سے بچانے کے لئے اور صحیح راستہ پر ڈالنے کے لئے اُن کا مقابلہ کرو تا کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔

(18) سورۃ ھود قرآن شریف کی گیارھویں سورۃ ہے اس میں فرماتا ہے اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ۔(ھود: 14) کہ مخالفین کہتے ہیں کہ اس نے اس کتاب کو اپنے پاس سے بنالیا ہے تم کہو اگر تم اس بیان میں سچے ہو تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں اپنے پاس سے بنالاؤ۔ قرآن مجید 23 سال میں اترا اور اس کے نزول کی ترتیب اس کی اس ترتیب سے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کی بالکل مختلف تھی مگر سورۃ ھود کی اس آیت کے نزول کے وقت ہی دس سورتوں کا مطالبہ اس کتاب کے عالم الغیب کی طرف سے اترنے کا قرینہ ہے۔

(19) اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے اعتراضات اور شرارتوں پر فرماتا ہے فَاصۡبِرۡ کہ تم صبر کرو اور حکمت یہ ہے اِنَّ الۡعَاقِبَۃَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔(ھود: 50) کہ اچھا انجام یقیناً تقویٰ اختیار کرنے والوں کا ہی ہوتا ہے۔

(20) سورۃ ھود حضرت شعیبؑ کی زبانی یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کے معاً بعد لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ۔(ھود: 85) کہ ماپ تول میں کمی نہ کیا کرو اور اگلی آیت میں فرمایا: وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ۔(ہود: 86) کہ اے میری قوم ماپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ مخلوق کے حقوق وابستہ ہیں اور بنی نوع انسان کی حق تلفی کرنے والا عبادت میں حق تلفی کر رہا ہے۔

(21) قرآن شریف فرماتا ہے: فَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ وَ مَنۡ تَابَ مَعَکَ۔(ھود: 113) کہ جیسے آپؐ کو حکم دیا گیا ہے استقامت دکھائیں اور وہ بھی جنہوں نے آپ کے ساتھ توبہ کی ہے۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ تحریر فرماتے ہیں:

”استقامت سے خداتعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت ہے۔ کمال استقامت یہ ہے کہ چاروں طرف بلاؤں کو محیط دیکھیں اور خدا کی راہ میں جان اور عزت اور آبرو کو معرض خطر میں پاویں اور کوئی تسلی دینے والی بات موجود نہ ہو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی امتحان کے طور پر تسلی دینے والے کشف یا خواب یا الہام کو بند کر دے اور ہولناک خوفوں میں چھوڑ دے۔ اس وقت نامردی نہ دکھلاویں اور بزدلوں کی طرح پیچھے نہ ہٹیں۔ اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں۔ صدق اور ثبات میں کوئی رخنہ نہ

ڈالیں۔ ذلت پر خوش ہو جائیں۔ موت پر راضی ہو جائیں اور ثابت قدمی کے لئے کسی دوست کا انتظار نہ کریں کہ وہ سہارا دے۔ نہ اس وقت خدا کی بشارتوں کے طالب ہوں کہ وقت نازک ہے اور باوجود سراسر بے کس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلّی کے نہ پانے کے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور ہر چہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے رکھ دیں اور قضاء و قدر کے آگے دم نہ ماریں اور ہرگز بے قراری اور جزع فزع نہ دکھلاویں جب تک کہ آزمائش کا حق پورا ہو جائے۔ یہی استقامت ہے جس سے خدا ملتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی رسولوں اور نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کی خاک سے اب تک خوشبو آ رہی ہے۔"

("اسلامی اصول کی فلاسفی" روحانی خزائن جلد 10 صفحہ 419،420)

(22) شرارت کرنے والے مخالفین کے بارہ میں ارشاد فرماتا ہے وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ فٰسِقُوۡنَ۔(التوبہ: 84)اس حکم کے ذریعہ مومنوں پر یہ شفقت کی گئی ہے کہ اگر یہ ارشاد نہ ہوتا اور مومن سمجھتے کہ ان کے تضرّع اور دعا سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ اپنی ہمدردی کے جوش میں ان کے لئے تضرع اور دعا میں ہلکان ہو جاتے۔ خدا تعالیٰ نے ان کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور مومنوں کو کرب و اذیّت سے بچایا ہے۔

(23) سورۃ توبہ میں مالی قربانی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کو ان مومنوں کے تزکیہ اور پاکیزگی کا ذریعہ بتایا گیا ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ وَ اٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا۔(التوبہ: 102)ایسے کمزور لوگوں کے دو علاج بتائے ہیں خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا اور وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ۔(التوبہ: 103) ظاہر ہے کہ یہ دونوں طریق پاکیزگی اور نشوونما کے لئے تیر بہدف ہیں۔

(24) قرآن مجید میں تقویٰ پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک ذریعہ صحبت صالحین بتایا گیا ہے جیسا کہ فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ۔(التوبہ: 119)اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقوی اختیار کرو اور صادقوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

(جاری ہے)

حفاظت قرآن

(اواب سعد حیات)

ابتداء سے سنت اللہ اس طرح پر جاری ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کو ہدایت اور رشد پانے کے ضروری سامانوں سے کبھی بھی محروم نہیں رکھاہے۔ تخلیق آدم سے لیکر انسانیت کے اس دور کے بارہ میں ہمیں قرآن بتاتا ہے کہ:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔(الفاطر:25)

ترجمہ: اور کوئی امت نہیں مگر ضرور اس میں کوئی ڈرانے والا گزراہے۔

اب ان انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق خدائی مدد اور ہدایت سے اصلاح کی کوششیں کیں اور کامیابیاں بھی پائیں۔ اور رفتہ رفتہ ان انبیاء کے دائرہ اصلاح میں وسعت آتی گئی۔ پھر اجتماعیت کی جانب سفر اپنے اس مقام پر جاپہنچا کہ ساری دنیا کو ایک نبی مخاطب کرے اور اس بارِ عظیم کو اٹھانے اور اس رفیع الشان ذمہ داری کو نبھانے کے لئے قرعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نکلا۔ اور آپ کو اس مقصد کے لئے قرآن جیسی کتاب دی گئی۔ قرآن کریم خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی آخری کتاب ہے جو کہ قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کے واسطے مکمل ضابطہ حیات اور ذریعہ فلاح و نجات ہے۔ اس قدر اہمیت کی حامل کتاب کی حفاظت کے موضوع پر چند سطور ان دلائل کی روشنی میں تحریر ہیں جو دنیا کے سامنے اس زمانہ کے امام حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رکھے۔ سب سے پہلے قرآن کریم کے ہی ان دعاوی کا پتہ ہونا ضروری ہے جو اس بابت اس کتاب میں درج ہیں۔ اس مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ کتاب میں خدائے قادر تاکید سے بھرے ہوئے الفاظ میں فرماتا ہے کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔(الحجر: 10)

ترجمہ: یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

گذشتہ کتب میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک کتاب کا ایک خاص دورِ اصلاح ہوا کرتا تھا اور وہ کتب اس خاص زمانے کی ضرورتوں اور پیش آمدہ مسائل کو ہی مخاطب کیا کرتی تھیں اور ان مسائل کا حل بتایا کرتی تھیں اور ایک مخصوص مدت

گزرنے کے بعد خدائے قادر کی حکمت بالغہ کے تحت ان کتب کا اثر اوران میں مذکور مسائل کا حل زمانے کے مسائل کی تعداد اور شدت سے پیچھے رہ جاتا تھا اور نئی کتاب کا دور شروع ہو جاتا تھا۔ اب قرآن قیامت تک کیلئے بطور قانون اور ضابطہ حیات ہے۔ اس مُحَوَّلَہ بالا حفاظتِ قرآن کے وعدہ کے اختتام کی آخری مدت خدا نے مقرر نہیں فرمائی۔ اس دلیل کو پرکھنے کے لئے اس ماحول کا اندازہ کر لینا کافی ہو گا کہ اگر دنیا میں آج حضرت موسیٰؑ کا لایا ہوا قانون یا حضرت عیسیٰؑ کی بتائی ہوئی باتیں بطور قانون اور ضابطہ حیات لاگو کر دی جائیں۔ نیز یہ فخر صرف اور صرف قرآن کو ہی حاصل ہے کہ اس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا نے اپنے ذمہ لیا ہے کیونکہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تورات کی حفاظت کا فریضہ ربّانی لوگوں اور احبار کے ذمہ تھا۔ دیکھو سورۃ المائدۃ: آیت 45 مطالعہ قرآن کے دوران ہم مُحَوَّلَہ بالا حفاظت قرآنی کے وعدہ کے علاوہ بھی اس کتاب کے اندر ہی اس کی حفاظت کے لئے خاص انتظامات کا متعدد جگہ اور مختلف طریقوں کا ذکر پڑھتے ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ۔ (القیامۃ:17)

ترجمہ: یقیناً اس کا جمع کرنا اور اس کی تلاوت ہماری ذمہ داری ہے۔

اس قرآن کو جو خدا کی طرف سے نام دیئے گئے ان میں الکتاب اور قرآن بھی ہیں، یہ دونوں نام اس کی تاقیامت زبانی اور کتابی شکل میں حفاظت کا پتہ دیتے ہیں۔ اوران ناموں کے معانی کے اندر اس کی حفاظت کی پیش گوئی موجود ہے۔ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (البینہ:4) کہہ کر اس کی تعلیمات کے دائمی ہونے کا پتہ دیا پھر فرمایا کہ: فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ۔ (البروج :23) یہ کتاب لوح محفوظ میں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں متعدد جگہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے حفاظتِ قرآن کی ذمہ داری آپ لینے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حفاظت کے لئے غیر معمولی کوشش اور جدوجہد سے روکا گیا ہے۔ مثلاً سورہ العنکبوت 47 تا50 اور سورہ قیامۃ کی بعض آیات، وغیرہ وغیرہ

حفاظت قرآن کے لئے جو الٰہی انتظامات آغاز سے ہی جاری ہوئے ان کا ذکر کرنے کے سے قبل خاکسار حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی وہ عربی عبارت پیش کرنا چاہتا ہے کہ جس میں نہایت اختصار کے ساتھ آپؑ نے جمع و تدوین قرآن کی تاریخ درج فرمادی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

”وَمَعَ ذٰلِكَ لَا شَكَّ أَنَّ الْقُرْآنَ وَحْيٌ مَتْلُوٌّ كُلُّهُ مُتَوَاتِرٌ قَطْعِيٌّ، حَتَّى النُّقَاطُ وَالْحُرُوْفُ وَأَنْزَلَهُ اللهُ بِاهْتِمَامٍ شَدِيْدٍ كَامِلٍ بِحِرَاسَةِ الْمَلَائِكَةِ، ثُمَّ مَا تَرَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَقِيْقَةً مِّنَ الْاِهْتِمَامَاتِ فِي أَمْرِهٖ، وَدَاوَمَ عَلٰى أَنْ يُكْتَبَ أَمَامَ عَيْنِهٖ آيَةً آيَةً كَمَا كَانَ يَنْزِلُ، حَتّٰى جَمَعَ كُلَّهٗ وَرَتَّبَ الْآيَاتِ، وَجَمَعَهٗ

بِنَفْسِهِ النَّفِيْسَةِ. وَكَانَ يُدَاوِمُ عَلَى قِرَاءَتِهِ فِي الصَّلَاةِ وَغَيْرِهَا، حَتَّى ارْتَحَلَ مِنْ دَارِ الدُّنْيَا، وَلَحِقَ بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلَى، وَلَاقَى مَحْبُوْبَهُ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ.

ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ قَامَ الْخَلِيْفَةُ الْأَوَّلُ أَبُوْ بَكْرِ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لِتَعَهُّدِ جَمِيْعِ سُوَرِهِ بِتَرْتِيْبٍ سَمِعَهُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ بَعْدَ الصِّدِّيْقِ الْأَكْبَرِ وَفَّقَ اللهُ الْخَلِيْفَةَ الثَّالِثَ، فَجَمَعَ الْقُرْآنَ عَلَى قِرَاءَةٍ وَاحِدَةٍ بِحَسَبِ لُغَةِ قُرَيْشٍ، وَأَشَاعَهُ فِي الْبِلَادِ.

وَمَعَ ذٰلِكَ كَانَ الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ كَالْحُفَّاظِ. وَكَانَ كَثِيْرٌ مِنْهُ فِي صُدُوْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَكَانُوْا يَقْرَؤُوْنَهُ فِي الصَّلَاةِ وَخَارِجِهَا، بَلْ كَانَ بَعْضُهُمْ حَافِظَ الْقُرْآنِ كُلِّهِ، وَكَانُوْا يَتْلُوْنَهُ فِي آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَكَانُوْا عَلَى تِلَاوَتِهِ مُدَاوِمِيْنَ۔“

(”حمامۃ البشریٰ“ روحانی خزائن جلد 7 صفحہ 217,216)

ترجمہ: ”مزید برآں قرآن بلاشبہ وحی متلو ہے۔ اور پورے کا پورا یہاں تک کہ نقطے اور حروف بھی قطعی متواتر ہیں۔ اور اللہ نے اسے کمال اہتمام کے ساتھ فرشتوں کی حفاظت میں نازل فرمایا ہے۔ پھر اس کے بارے میں تمام قسم کے اہتمام کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ایک آیت جیسے وہ (قرآن) نازل ہوتا رہا، لکھنے پر مداومت فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ نے اسے مکمل طور پر جمع فرمایا اور بنفس نفیس آیات کو ترتیب دیا اور انہیں جمع کیا اور نماز میں اور نماز سے باہر اس کی تلاوت پر مداومت فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اور اپنے رفیق اعلیٰ اور محبوب رب العالمین سے جا ملے۔ پھر اس کے بعد خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی تمام سورتوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ترتیب کے مطابق جمع کرنے کا اہتمام فرمایا۔ پھر (حضرت) ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد اللہ نے خلیفہ ثالث (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو توفیق عطا فرمائی۔ تو آپ نے لغت قریش کے مطابق قرآن کو ایک قراءت پر جمع کیا اور اسے تمام ملکوں میں پھیلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمام صحابہ (کرامؓ) قرآن کو حافظوں کی طرح پڑھتے تھے اور اس (قرآن) کا بیشتر حصہ مومنوں کے سینوں میں (محفوظ) تھا اور وہ اسے نماز میں اور نماز سے باہر پڑھتے رہتے تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض تو پورے قرآن کے حافظ تھے اور وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس کی تلاوت کرتے تھے اور اس کی تلاوت پر مداومت اختیار کرتے تھے۔“

(ترجمہ از مترجم ”حمامۃ البشریٰ“ اردو صفحہ 101، 102)

حفاظت قرآن کے لئے خدا تعالیٰ نے جو انتظامات فرمائے اس کا مختصر خاکہ کچھ اس طرح پر ہے کہ جو بھی آیات

نازل ہوتی تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً کاتب صحابہ کو بلا کر ان آیات کو ضبط تحریر میں لے آتے تھے اور یہ ساری کارروائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے ہوتی تھی اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے، لکھوانے کے بعد اس نازل شدہ حصہ کو سنا بھی کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود لکھواتے تھے بلکہ خدائی تفہیم کے مطابق ان کی ترتیب بھی خود مقرر فرماتے جاتے تھے۔اس بات کا تفصیلی نقشہ مستند کتب احادیث میں موجود ہے بطور نمونہ ایک روایت درج ہے۔

ابْنُ عَبَّاسٍ، قَالَ: ...قَالَ عُثْمَانُ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ يُنْزَلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ، فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُولُ: ضَعُوا هَؤُلَاءِ الآيَاتِ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا وَإِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الآيَةَ فَيَقُولُ: ضَعُوا هَذِهِ الآيَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا...

(''جامع ترمذی'' کتاب تفسیر القرآن باب ومن سورۃ التوبۃ حدیث: 3086)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیات اکٹھی نازل ہوتی تھیں تو آپ اپنے کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر ارشاد فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھو اور اگر ایک ہی آیت اترتی تھی تو پھر بھی اسی طرح کسی کاتب وحی کو بلا کر اور جگہ بتا کر اسے تحریر کروا دیتے تھے۔

کتابتِ وحی کی اس مقدس اور انتہائی اہم ڈیوٹی انجام دینے کی سعادت حاصل کرنے والے اصحاب کے اسماء اور ان کی پاکیزہ ذاتی زندگیوں کے واقعات کتبِ تاریخ کا حصہ ہیں۔

دوسرا بڑا ذریعہ خدا نے حفاظتِ قرآن کے لئے یہ قائم فرمایا کہ مسلمانوں کے اندر اس کتاب کو حفظ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ایک تو خدا نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں اس کتاب کو حفظ کرنے کا شوق پیدا کر دیا اور دوسرا اس کی عبارت اس قدر خوبصورت، سلیس اور نظم ونثر کے درمیان ہے کہ جو حفظ کرنے کے لئے بہت آسان ہے۔ہر مسلمان کو نماز کے اندر پڑھنے کے لئے قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ زبانی یاد کرنا پڑتا ہے۔کیونکہ ہر رکعت کے اندر سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد چند آیات کی تلاوت کرنا فرض ہے۔اس وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کئی حافظ پیدا ہو گئے۔نماز کے اندر اور اس کے علاوہ بھی تلاوت کرنا صحابہ اور دیگر مسلمان باعثِ ثواب خیال کر کے اکثر تلاوت کرتے تھے اور کرتے ہیں۔حفظ قرآن پر ترغیب دینے والی ایک بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی ہیں

جن کے اندر آپؐ نے ان فضیلتوں اور ثواب کا ذکر فرمایا ہے جو کہ حافظِ قرآن کے لئے خاص ہیں۔ پھر آنحضورؐ نے اپنی زندگی میں ہی درست حفظ اور درست تلاوت میں مدد دینے کے لئے استاد مقرر فرمادیئے۔ اوران اساتذہ کی کوششوں کے ثمرات کی نگرانی بھی فرماتے تھے ان تمام کوششوں کے نتیجہ میں جو حافظ پیدا ہوئے ان کی تعداد ہزاروں تھی اس کا ایک اندازہ ان حافظوں کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں 6 ہجری کو بئر معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے ان کی تعداد 70 بتائی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراًبعد مسیلمہ کے خلاف حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں خالد بن ولیدؓ کے ماتحت جنگ ہوئی اس ایک لشکر میں 3000 حافظ صحابہ شامل ہوئے جن میں سے 500 شہادت کے رتبہ تک پہنچے پھر وقت کے ساتھ ساتھ قرآن کے لاکھوں حافظ پیدا ہوگئے۔

قرآن کریم کا عرصہِ نزول تیئیس سال پر محیط ہے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ایام کم وبیش سات ہزار نوسوستر (7970) بنتے ہیں اور قرآنی آیات کی تعداد چھ ہزار دوسوسولہ (6216) ہے اور قرآن کے الفاظ کی تعداد ستتر ہزار نوسو تینتیس (77933) بتائی گئی ہے۔ اور قرآنی حروف کی مجموعی تعداد الاتقان فی علوم القرآن از علامہ سیوطی میں حضرت ابن عباسؓ کے بیان کے مطابق تین لاکھ تیئیس ہزار چھ سو اکہتر (323671) ہے۔

(الاتقان فی علوم القرآن (اردو) تصنیف علامہ جلال الدین سیوطیؒ جلد 1 صفحہ 176)

اوراگر آیات اورالفاظ کی مجموعی تعداداوراس طویل عرصہ کا حساب لگایاجائے تو فی یوم نزولِ قرآن کی اوسط صرف نو الفاظ بنتی ہے۔ اور فی یوم آیات کی اوسط ایک آیت بھی نہیں بنتی ہے۔ کبھی لمبی سورتیں بھی نازل ہوتیں اور کبھی قرآنی وحی کے نزول میں وقفہ بھی پڑ جاتا تھا۔ آغاز نبوت میں نزول آیات کم تھااورآخری ایام حیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پے درپے سورتوں کا نزول ہوا۔ مگر ہماری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس قدر مختصر حصہ کو ساتھ ساتھ محفوظ اور یاد کرلینا کچھ بھی مشکل کام نہ تھا جبکہ آیات میں مذکور اکثر واقعات کا ظہور بھی ساتھ مشاہدہ کیا جارہا ہو۔

اور پھر قرآن کی ہزارہا تفاسیر اوراس کی درست تلاوت میں مدد دینے کیلئے ہزارہا استاد سارے عالم اسلام میں پھیل گئے۔ سارے عالم اسلام کی مساجد میں نمازوں کے اندر قرآن کی باآواز بلند تلاوت ہونے لگی۔ نمازاوراس کے علاوہ تلاوت، روزانہ صبح کی تلاوت تو مسلمانوں کا معمول ہے اوراس کی ترغیب تو خود قرآن نے دی ہے اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حفاظ کی کثرت اور مسلمانوں میں تلاوت قرآن کی طرف بے پناہ توجہ کا نقشہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک مخالف کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

''مسلمان جس پاک اور کامل کتاب پر ایمان لائے ہیں کس قدر اس مقدس کتاب کو انہوں نے اپنے ضبط میں

کرلیاہے عموماً تمام مسلمان ایک حصہ کثیر قرآن شریف کاحفظ رکھتے ہیں جس کو پنج وقت مساجد میں نماز کی حالت میں پڑھتے ہیں۔ابھی بچہ پانچ یاچھ برس کاہواجو قرآن شریف اس کے آگے رکھاگیا۔لاکھوں آدمی ایسے پاؤگے جن کو ساراقرآن شریف اول سے آخرتک حفظ ہے اگر ایک حرف بھی کسی جگہ سے پوچھو تواگلی پچھلی عبارتیں سب پڑھ کرسنادیں اور مردوں پر کیاموقوف ہے ہزاروں عورتیں ساراقرآن حفظ رکھتی ہیں۔کسی شہر میں جاکر مساجدومدارس اسلامیہ میں دیکھوصدہالڑکوں اور لڑکیوں کوپاؤگے کہ قرآن شریف آگے رکھے ہیں اور باترجمہ پڑھ رہے ہیں یاحفظ کررہے ہیں۔‘‘

(’’شحنۂ حق‘‘ روحانی خزائن جلد2صفحہ 331،332)

قرآن کے جو نسخے سارے عالم میں پھیلے اوران کی تعداد بلامبالغہ کروڑوں میں ہے۔سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بھی قرآن ہی ہے۔ آج کے اس جدید پریس کے زمانہ میں قرآن کے نسخے بلامبالغہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اوران کی چھپائی میں اغلاط اور ہر طرح کے سقم سے بچنے کے لئے زرکثیر اور شدید عرق ریزی خرچ کرکے اس کی اعلیٰ حفاظت کاانتظام کیاجاتاہے۔اور مسلمان ممالک میں پورے پورے محکمے اس ڈیوٹی کو سرانجام دیتے ہیں۔ نیز گذشتہ وقتوں میں مسلمانوں کی اس طرف بے پناہ توجہ کااندازہ ہمیں ان قلمی نسخوں سے بھی ہوتاہے جو آج کل لائبریریوں کی زینت ہیں۔اور مسلمانوں میں اس کی کتابت کااس قدررواج تھاکہ کیاعوام بڑے بڑے بادشاہ بھی اس کی کتابت نہایت محبت اور جانفشانی سے کیاکرتے تھے۔

قرآن کی حفاظت پرایک گواہ وہ تبلیغ قرآن ہے جوانتہائی قلیل عرصہ میں بڑے خطہ زمین پر پھیل گئی۔دیگر مخالف اقوام کواس کی تعلیمات کابخوبی علم ہوگیا۔جن تک اس کی تعلیم پہنچی وہ لاکھوں کروڑوں تھے اوران کاحلقہ بہت وسیع ہے قرآن کی تبلیغ واشاعت مشرکین کے سامنے ہوئی۔یہودونصاریٰ ،مجوسی اردگرد تھے اوراس قرآن کے اندران کے عقائد کاذکرہے اگرایک بات بھی ان کی طرف ایسی منسوب کی جاتی جو ان میں موجود نہ تھی تو فوراًبول اٹھتے مثلاً شق القمر پر مشرکین مکہ کااعتراف واعتراض قرآن میں منقول ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

’’قرآن شریف ایک ایسی کتاب ہے جو آیت آیت اس کی بروقت نزول ہزاروں مسلمانوں اور منکروں کوسنائی جاتی تھی اوراسی کی تبلیغ ہوتی تھی اور صدہااسکے حافظ تھے مسلمان لوگ نمازاور خارج نماز میں اس کوپڑھتے تھے پس جس حالت میں صریح قرآن شریف میں وارد ہواکہ چاند دوٹکڑے ہوگیااور جب کافروں نے یہ نشان دیکھاتوکہاکہ جادوہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتاہے اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ﴿۲﴾ وَ اِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَ یَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ۔(القمر:2،3) اس

صورت میں اس وقت کے منکرین پر لازم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جاتے اور کہتے کہ آپ نے کب اور کس وقت چاند کو دو ٹکڑے کیا اور کب اس کو ہم نے دیکھا لیکن جس حالت میں بعد مشہور اور شائع ہونے اس آیت کے سب مخالفین چپ رہے اور کسی نے دم بھی نہ مارا تو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ضرور دیکھا تھا تب ہی تو ان کو چون وچرا کرنے کی گنجائش نہ رہی غرض یہ بات بہت صاف اور ایک راست طبع محقق کے لئے بہت فائدہ مند ہے کہ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی جھوٹا معجزہ بحوالہ اپنے مخالفوں کی گواہی کے لکھ نہیں سکتے تھے اور اگر کچھ جھوٹ لکھتے تو ان کے مخالف ہمعصر اور ہم شہر اس زمانہ کے اسے کب پیش جانے دیتے۔علاوہ اس کے سوچنا چاہئے کہ وہ مسلمان لوگ جن کو یہ آیت سنائی گئی اور سنائی جاتی تھی وہ بھی تو ہزاروں آدمی تھے اور ہر یک شخص اپنے دل سے یہ محکم گواہی پاتا ہے کہ اگر کسی پیر یا مرشد یا پیغمبر سے کوئی امر محض دروغ اور افتراء ظہور میں آوے تو سارا اعتقاد ٹوٹ جاتا ہے اور ایسا شخص ہر ایک شخص کی نظر میں برا معلوم ہونے لگتا ہے،اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ اگر یہ معجزہ ظہور میں نہیں آیا تھا اور افترا محض تھا تو چاہئے تھا کہ ہزارہا مسلمان جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے ایسے کذب صریح کو دیکھ کر یکلخت سارے کے سارے مرتد ہو جاتے۔"

(" سرمہ چشم آریہ" روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 110،111)

اس کے علاوہ قرآنی بیان اپنوں کے سامنے بھی تھا مسلمانوں کے اندر ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف تیس سال بعد دو بڑے مکاتب فکر بن گئے جو آپس میں شدید معارض اور مخالف تھے اب اگر ایک فرقہ بھی قرآن میں کچھ زائد داخل کرتا یا قرآنی بیان کو بدلتا تو فوراً دوسرا فریق اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر سکتا تھا مگر اس قدر مفصل تاریخ کے اندر ہمیں ایک بھی ایسی کوشش نظر نہیں آتی۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں۔

"کیونکہ جو فاضل قسیس اور باخبر انگریز ہیں وہ لوگ بباعث اپنے عام اور وسیع واقفیت کے خوب جانتے ہیں کہ جس طور اور التزام سے قرآنِ شریف نے اشاعت پائی ہے اور جس تشدد سے مخالفوں اور موافقوں کی نگرانی اس کی آیت آیت پر رہی ہے اور جس سرعت اور جلدی سے اس کے ہر یک مضمون کی تبلیغ لاکھوں آدمیوں کو ہوتی رہی ہے اور جس قلیل عرصہ میں جو بعد زمانہ نبوی تیس برس سے بھی کم تھا وہ دنیا کے اکثر حصوں میں شہرت پا گیا ہے وہ ایسا طور اور طریق چاروں طرف سے محفوظ ہے کہ اس میں یہ گنجائش ہی نہیں کہ کوئی جھوٹا معجزہ یا کوئی جھوٹی پیش گوئی افترا کر کے قرآن شریف میں درج ہو سکتی جس کے افتراء پر عیسائیوں یہودیوں عربوں مجوسیوں میں سے کسی کو بھی اطلاع نہ ہوتی۔"

(" سرمہ چشم آریہ" روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 129)

حضرت مسیح موعودؑ نے ایک مخالف کے اس اعتراض کے جواب میں کہ قرآن میں لکھی بات تاریخی شہادت نہیں ہے،ایک زبردست چیلنج دیا۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

"آپ فرماتے ہیں کہ قرآن میں لکھا جانا تاریخی ثبوت نہیں تو پھر آپ ہی فرماویں کہ جس حالت میں ایسی کتاب کی تحریر تاریخی ثبوت نہیں ہو سکتی جو اپنے زمانہ کا ایک شہرت یافتہ واقعہ مخالفوں کی گواہی کے حوالہ سے بتلاتی ہے اور کتاب بھی ایک ایسے شخص کی کتاب ہے جو تمام دنیامیں عزت اور مرتبت کے ساتھ مشہور ہے تو پھر تاریخی ثبوت کسے کہتے ہیں۔ کیا تاریخوں کے تمام مجموعہ میں اس سے عمدہ تر کوئی ثبوت مل سکتاہے کہ کوئی واقعہ ہم ایسی کتاب میں لکھا ہوا پاویں جو اسی زمانہ کا واقعہ ہو جس زمانہ کی وہ کتاب ہے اور اسی مصنف نے اس کو لکھا ہو جس نے اس کو دیکھا بھی ہو اور وہ مؤلف کتاب بھی اپنی شہرت اور عزت میں سر آمد روزگار ہو۔ اور پھر باوجود ان سب باتوں کے مصنف نے مخالفوں کو بطور گواہ واقعہ قرار دیا ہو۔ اور پھر وہ کتاب بھی ایسی محفوظ چلی آتی ہو کہ اسی زمانہ میں اکثر حصہ دنیامیں شہرت پا گئی ہو اور ہزارہا حافظ اسکی ابتداء سے ہوتے آئے ہوں یہاں تک کہ لاکھوں حافظوں تک نوبت پہنچ گئی ہو اور اسی زمانہ کے اس کے قلمی نسخے اور بعض تفسیریں بھی موجود ہوں اور بے شمار بندگانِ خدا ابتدا سے اس کو اپنی پنجگانہ نمازوں میں پڑھتے اور تلاوت کرتے اور نیز پڑھاتے چلے آئے ہوں اگر کوئی تاریخی کتاب ان سب صفتوں کی جامع دنیابھر میں بجز قرآن شریف کے آپ کی نظر میں گزری ہے تو آپ اس کو پیش کریں اور اگر پیش نہ کر سکیں تو آپ کی سزا وہی درد خجالت اور انفعال کافی ہے جو لاجواب رہنے کی حالت میں آپ کے عائد حال ہو گی۔"

("سرمہ چشم آریہ" روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 128)

قرآن کی عظیم الشان حفاظت الٰہی پر ایک نشانی عربی زبان بھی ہے۔ قرآن کریم کی زبان کو بھی اللہ نے محفوظ رکھا ورنہ اسوقت گذشتہ الہامی کتب کی زبانیں اسی طرح محفوظ اور رائج الوقت اور عام نہیں ہیں۔ خدا نے نہ صرف اس زبان کو محفوظ رکھا بلکہ ترقی پر ترقی دی اور اس کا دائرہ اور بولنے والوں میں وسعت پر وسعت بخشی۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد علمی عربی زبان میں تبدیلی بند ہو گئی۔ انگریزی زبان میں تو صرف تین چار سو سال گزرنے پر ہی چاسر (Chauser) اور شیکسپئر (Shakespeare) کی کتابیں سمجھنے کے لئے زبان کی تشریح کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کی زبان سمجھنے کے لئے گذشتہ لغات کی ضرورت نہیں بلکہ جو شخص آج بھی علمی عربی پڑھتاہے تو وہ قرآن کی عربی باآسانی سمجھ سکتاہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ اس موضوع پر فرماتے ہیں کہ:

"اس وعدے کے ایک حصے کو پورا کرنے کے یعنی قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو سامان

کئے ہیں ان کا مطالعہ انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک قرآن کریم نازل نہ ہوا تھا، نہ عربی زبان مدون ہوئی تھی، نہ اس کے قواعد مرتب ہوئے تھے نہ لغت تھی نہ محاورات کا احاطہ کیا گیا تھا نہ معانی اور بیان کے قواعد کا استخراج کیا گیا تھا اور نہ تحریر کی حفاظت کا سامان ہی کچھ موجود تھا۔ مگر قرآن کریم کے نزول کے بعد اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے دلوں میں القاء کر کے ان سب علوم کو مدون کروایا اور صرف قرآن کریم ہی کی حفاظت کے خیال سے علم صرف و نحو اور علم معانی و بیان اور علم تجوید اور علم لغت اور علم محاورہ زبان اور علم تاریخ اور علم قواعد، تدوین تاریخ اور علم فقہ وغیرہ علوم کی بنیاد پڑی اور ان علوم نے اسی قدر زیادہ ترقی حاصل کی جس قدر کہ ان علوم کی حفاظت کا قرآن کریم سے تعلق تھا۔ چنانچہ ظاہری علوم میں سے صَرف و نحو اور لغت کا تعلق حفاظت قرآن کے ساتھ سب سے زیادہ ہے اور ان علوم کو اس قدر ترقی حاصل ہوئی ہے کہ یورپ کے لوگ اس زمانے میں بھی عربی صَرف و نحو اور لغت کو سب زبانوں کی صَرف و نحو اور لغت سے اعلیٰ اور زیادہ مدون خیال کرتے ہیں۔'' ('' دعوۃ الامیر'' انوار العلوم جلد 7 صفحہ 380، 381)

کہتے ہیں کہ اَلْفَضْلُ مَا شَہِدَتْ بِہِ الْاَعْدَاءُ، اس اصول کے مطابق حفاظت قرآن کے بابت مستشرقین کا اعتراف درج کرنا بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ ان فاضل اہل مغرب میں سے اکثر نے اپنی عمریں اس طرح پر خرچ کر دیں کہ اس پاک اور حسین تعلیم میں خامیاں اور نقائص نکال سکیں مگر خدا نے ان کو ہر دور میں ناکام رکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک مخالف کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ:

''آپ کو خبر نہیں کہ دنیا میں جس قدر بڑے بڑے مخالف باعلم عیسائی یہودی مجوسی وغیرہ ہیں وہ قرآنی شہادتوں سے یعنی ان واقعات سے جو قرآن شریف نے اپنے زمانہ کے متعلق لکھے ہیں انکار نہیں کر سکتے۔ ہاں تعصب کی راہ سے بعض آیات کے معنے اور طور پر کر لیتے ہیں۔''

('' سرمہ چشم آریہ'' روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 128، 129)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عظمت قرآن کے منکر ایک آریہ کو مخاطب کر کے یہ گواہیاں بطور نمونہ درج فرمائی ہیں کہ:

''پھر دیکھنا چاہئے کہ یہی صاحب دیون پورٹ اپنے رسالہ مذکورہ کے صفحہ 72 سے صفحہ 83 تک قرآن شریف کی بدیں الفاظ تعریف و مدح کرتے ہیں۔ چنانچہ اصل عبارت ان کی لکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

مسلمان قرآن شریف کی ایسی عظمت کرتے ہیں کہ عیسائیوں نے اپنی انجیل کی کبھی ایسی تکریم ہوتے نہیں دیکھی قرآن شریف میں صرف احکام مذہبی و تہذیب اخلاق ہی کا ذکر نہیں بلکہ گبن صاحب کا قول ہے کہ اوقیانوس سے گنگا تک

قرآن شریف مجموعہ قوانین مانا جاتا ہے۔ قرآن میں قوانین دیوانی و فوجداری و سلوک باہمی پائے جاتے ہیں اور وہ مسائل نجات روح و حقوق عامہ و حقوق شخصی و نفع رسانی خلائق وغیرہ پر حاوی ہے منجملہ محاسن و خوبیوں قرآن کے جس پر اہل اسلام کو ناز کرنا بجا ہے وہ باتیں نہایت عمدہ ہیں اول قرآن شریف کی وہ خوش بیانی جس میں خدائے تعالیٰ کا ذکر ہے اور جس کے سننے سے آدمی کے دل پر ایک طرح کا اثر پیدا ہوتا اور خوف آتا ہے۔ دوسرے قرآن تمام ان خیالات سے مبرا ہے جو خلاف تہذیب خیال کئے جاسکتے ہیں اور اس کے تمام اصول ایسے ہیں جو کوئی ان میں سے خلاف عقل نہیں مگر افسوس کہ یہ عیب یہودیوں کی مقدس کتابوں میں اکثر واقعہ ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں سب کو اتفاق ہے اور کوئی ایسی بات نہیں جو زبردستی ماں لینی پڑے اور سمجھ میں نہ آوے فقط۔

یہ بیان قرآن شریف کی نسبت تو جان بورٹ صاحب کا ہے اور ایسا ہی کارلل صاحب اپنی کتاب کی جلد 6 صفحہ 214 میں لکھتے ہیں کہ قرآن شریف کے پڑھنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ صادق کا کلام ہے اور صداقت سے پر ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر جن کے گھر میں گویا آج طبعی اور ہیئت نے جنم لیا ہوا ہے اور جو سورج اور چاند وغیرہ کی کیفیت آپ لوگوں سے بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں وہ کس قدر قرآن شریف کے معقولانہ مسائل کے قائل اور مداح ہیں اور کیسی اپنی صاف طینتی کی وجہ سے صاف اقرار کرتے ہیں کہ قرآنِ شریف کے مسائل علومِ عقلیہ کے خلاف نہیں ہیں اور کوئی اس میں ایسا اعتقاد نہیں جو زبردستی ماننا پڑے پس جس حالت میں ایسے لوگ جو فلاسفی کے پتلے خیال کئے جاتے ہیں۔ قرآن شریف کے حکیمانہ طور و طریق کی کھلی کھلی شہادتیں دیتے ہیں تو پھر اگر آپ اے ماسٹر صاحب یا آپ کا کوئی اور بھائی جن کی آنکھیں انہیں لوگوں کے علوم پڑھنے سے کچھ کچھ کھلی ہیں اور یہی لوگ آپ کے معلم اور استاد ہیں فضائل قرآنی سے انکاری رہیں تو اس سے قرآنَ شریف کا کیا نقصان ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یورپ اور ایشیا کے تمام مخالف فضائل قرآنیہ سے انکار کرتے تو بھی کچھ نقصان کی بات نہ تھی آفتاب بہرحال آفتاب ہی ہے چاہے کوئی اس کی روشنی کا اقراری ہو یا نہ ہو مگر یورپ کے فاضل اور صاحب علم لوگ اس قدر قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے بیسیوں کتابیں تالیف کر کے قرآن شریف کے بارہ میں شہادت حقہ کو ادا کر دیا ہے اور باستثناء نیم ملاں پادریوں کی جو تنخواہیں پا کر اسلام سے عناد رکھتے ہیں باقی جس قدر واقعی دانا اور فلاسفر ہیں ان کے دلوں میں دن بدن محبت اسلام کی پیدا ہوتی جاتی ہے لیکن آپ لوگوں کی نسبت کیا کہیں اور کیا لکھیں اور کیا تحریر میں لاویں کہ ناحق بے موجب سراسر عناد اور بخل کی راہ سے نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔“

(”سرمہ چشم آریہ“ روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 194 تا 196)

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بحث کے بعد لکھتا ہے کہ

… … Since what we now have, though possibily corrected and modified by himself, is still his own.

(THE LIFE OF MOHAMET by SIR WILLIAM MUIR Page 562)

مفہوماً ترجمہ: اب جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے۔گو یہ بالکل ممکن ہے کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے زمانہ میں خود اس کی غلطیاں درست کی ہوں۔اور بعض دفعہ خود ہی اس میں بعض تبدیلیاں بھی کر دی ہوں۔مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ اب اس زمانہ تک وہی قرآن ہے۔جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں دیا تھا۔“

وہ پھر لکھتا ہے کہ:

we may upon the strongest presumption affirm that every verse in the Coran is the genuine and unaltered composition of Mahomet himself.

(THE LIFE OF MOHAMET by SIR WILLIAM MUIR Page 562)

مفہوماً ترجمہ: ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے۔اور محمد (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی غیر محرف تصنیف ہے۔

......and conclude with at least a close approximation to the verdict of Von Hammer: That we hold the Coran to be as surely Mahomet's word, as the Mahometans hold it to be the word of God.

(THE LIFE OF MOHAMET by SIR WILLIAM MUIR Page 562-563)

مفہوماً ترجمہ: ہم وان ہیمر کے مندرجہ ذیل فیصلہ کے بالکل مطابق نہ سہی۔کم سے کم اس خیال کے بہت موافق فیصلہ تک ضرور پہنچے ہیں۔وان ہیمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو قرآن موجود ہے۔ہم ویسے ہی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصلی صورت میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا کلام ہے۔جس یقین سے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدل کلام ہے۔

پھر لکھا کہ:

......and that there is otherwise every security internal and external, that we posses a text the same as that which Mahomat himself gave forth and used.

(THE LIFE OF MOHAMET by SIR WILLIAM MUIR Page 561)

مفہوماً ترجمہ: اس کے علاوہ ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت موجود ہے۔اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی۔ کہ یہ کتاب جو ہمارے پاس ہے۔ وہی ہے جو خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔اور اسے استعمال کیا کرتے تھے۔

نولڈکی کا قول ہے۔

Slight clerical errors there may have been, but the Quran of Othman contains none but genuine elements, though sometime in very strong order. Efforts of European scholarsto prove the existance of later interpolation in the Quran have failed.

(Encylopedia Britanica Volume 15 Edition 11th under word KORAN)

مفہوماً ترجمہ: ممکن ہے کہ تحریر کی معمولی غلطیاں (طرز تحریر) ہوں تو ہوں۔ لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے۔ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔ گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔ یورپین علماء کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

میور نے نہایت حسرت کے الفاظ میں بات یہاں ختم کی ہے۔

To compare (as the Moslems are fond of doing) their pure text with the various readings of our Scriptures, is to compare things between which there is no analogy.

(THE LIFE OF MOHAMET by SIR WILLIAM MUIR Page 558)

مفہوماً ترجمہ: مسلمانوں کی بالکل پاک اور غیر تبدیل شدہ کتاب اور ہماری کتب کے مختلف نسخوں کے باہمی اختلاف کا مقابلہ کرنا (اور اس بات کا مسلمانوں کو شوق بھی بہت ہے) بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جائے جن میں باہمی کوئی بھی مشابہت نہیں۔

یہ تو ظاہری حفاظت کا معاملہ ہے۔ حفاظت کی اقسام کے موضوع پر حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ:

”اب حفاظت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو حفاظت ظاہری اور ایک حفاظت معنوی جب تک دونوں قسم کی حفاظت نہ ہو کوئی چیز محفوظ نہیں کہلا سکتی... ایک کتاب جس کے اندر لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ عبارتیں زائد کر دی ہوں یا اس کی بعض عبارتیں حذف کر دی ہوں یا جس کی زبان مردہ ہو گئی ہو اور کوئی اس کے سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتا ہو یا جو اس غرض

کے پورا کرنے سے قاصر ہو گئی ہو جس کے لئے وہ نازل کی گئی تھی محفوظ نہیں کہلا سکتی... کیونکہ گو اس کی حفاظت بھی صرف معنی کی حفاظت ہی کے لئے کی جاتی ہے پس قرآن کریم کی حفاظت سے مراد اس کے الفاظ اور اس کے مطالب دونوں کی حفاظت ہے۔"
("دعوۃ الامیر" انوارالعلوم جلد7 صفحہ 380)

خدا تعالیٰ نے اس معنوی حفاظت کے میدان کو بھی تشنہ نہ چھوڑا اور گذشتہ چودہ سو سال میں کوئی وقت بھی ایسا نہ گزرا کہ جس میں ہمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نہ کوئی روحانی فرزند اپنی تمام خداداد طاقتوں اور استعدادوں کے ساتھ اس راہ میں مصروف عمل نظر نہ آتا ہو۔ ان محافظین قرآن کو ان کے کام اور وقت کے لحاظ سے نام اور خطاب تو مختلف ملے مگر سب کا مشترک مقصد اس کتاب کی حفاظت ہی تھا۔ اس کی ہر طرح کی حفاظت کے لئے انہوں نے ہر طرح کے فتنوں کا قلع قمع کیا اور اس کتاب کے درست اور حقیقی معانی عوام الناس تک پہنچاتے رہے اور غلط معانی کی درستگی کرواتے رہے۔ ان سب محافظین قرآن کا سردار خدا نے مسیح موعود کی شکل میں کھڑا کیا جس نے آکر بڑے عظیم الشان اعلانات کئے اور حفاظتِ قرآن کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے اعلانِ عام کیا کہ قرآن کی کوئی آیت، کوئی نقطہ، حتیٰ کہ اسکا کوئی شعشہ بھی منسوخ یا ناقابلِ عمل نہیں ہے بلکہ قرآن کریم مکمل محفوظ اور خدا کی طرف سے تاقیامت قابلِ عمل تعلیم کا مجموعہ ہے۔ آپ علیہ السلام نے بطور حکم اور عدل اعلان کیا کہ:

وَبِأَنَّ الْقُرْآنَ الْمَجِيْدَ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَحْفُوْظٌ مِّنْ تَحْرِيْفِ الْمُحَرِّفِيْنَ وَخَطَأِ الْمُخْطِئِيْنَ۔

("آئینہ کمالاتِ اسلام" روحانی خزائن جلد5 صفحہ 21)

ترجمہ: اور اس وجہ سے کہ قرآن مجید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب تک تحریف کرنے والوں کی تحریف اور خطاکاروں کی خطاؤں سے پاک ہے۔

آپؑ نے جلالی الفاظ میں چیلنج دیا کہ:

"...ہم نے منکرین کو ملزم اور رسوا کرنے کے لئے جا بجا بصراحت لکھ دیا ہے اور بآواز بلند سنا دیا ہے کہ اگر کوئی برہمو قرآن شریف کے کسی بیان کو خلافِ صداقت سمجھتا ہے یا کسی صداقت سے خالی خیال کرتا ہے تو وہ اپنا اعتراض پیش کرے۔ ہم خدا کے فضل سے اس کے وہم کو ایسا دور کریں گے کہ جس بات کو وہ اپنے خیالِ باطل میں ایک عیب سمجھتا تھا اس کا ہنر ہونا اس پر آشکار ہو جائے گا۔"

("براہین احمدیہ" روحانی خزائن جلد1 صفحہ 327 حاشیہ)

آپؑ نے نو ایجاد فلسفے سے مرعوب ہو کر قرآنی صداقتوں میں تاویل کرنے والے ایک شخص کو مخاطب کر کے

فرمایا:

”آپ کو یادرہے کہ قرآن کا ایک نقطہ یا شعشہ بھی اولین اورآخرین کے فلسفہ کے مجموعی حملہ سے ذرہ سے نقصان کا اندیشہ نہیں رکھتا۔ وہ ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرے گا اس کو پاش پاش کرے گا۔ اور جو اس پر گرے گا۔ وہ خود پاش پاش ہو جائے گا۔“ (”آئینہ کمالاتِ اسلام“ روحانی خزائن جلد5 صفحہ 257 حاشیہ)

حضرت مسیح موعودؑ نے حفاظتِ معنوی اوراپنے خدا داد منصب کا حق ادا کرتے ہوئے ہر طرح کے معترضین کو مخاطب کر کے فرمایا:

”اگر آپ لوگ کوئی بھاری صداقت لئے بیٹھے ہیں جس کی نسبت تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے کمال جانفشانی اور عرق ریزی اور موشگافی سے اُس کو پیدا کیا ہے اور جو تمہارے گمان باطل میں قرآن شریف اس صداقت کے بیان کرنے سے قاصر ہے تو تمہیں قسم ہے کہ سب کاروبار چھوڑ کر وہ صداقت ہمارے روبرو پیش کرو۔ تاہم تم کو قرآن شریف میں سے نکال کر دکھلا دیں۔ مگر پھر مسلمان ہونے پر مستعد رہو۔ اور اگر اب بھی آپ بدگمانی اور بک بک کرنا نہ چھوڑیں اور مناظرہ کا سیدھا راستہ اختیار نہ کریں۔ تو بجز اس کے اور کیا کہیں کہ لعنة اللہ علی الکاذبین۔“
(”براہین احمدیہ“ روحانی خزائن جلد1 صفحہ 227 حاشیہ)

پھر آپؑ نے فرمایا کہ:

”بلکہ ہمارا خداوند کریم کہ جو دلوں کے پوشیدہ بھیدوں کو خوب جانتا ہے۔ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ذرہ کا ہزارم حصہ بھی قرآن شریف کی تعلیم میں کچھ نقص نکال سکے یا بمقابلہ اس کے اپنی کسی کتاب کی ایک ذرہ بھر کوئی ایسی خوبی ثابت کر سکے کہ جو قرآنی تعلیم کے برخلاف ہو۔ اور اس سے بہتر ہو۔ تو ہم سزائے موت بھی قبول کرنے کو طیار ہیں۔“ (”براہین احمدیہ“ روحانی خزائن جلد1 صفحہ 298 حاشیہ)

پھر حضرت مسیح موعودؑ کے بعد خدا نے قدرتِ ثانیہ کے ظہور کے طور پر خلافت کا نظام قائم فرمایا خدا کی جانب سے کھڑے کئے جانے والے یہ مسیح موعودؑ کے خلفاء بھی محافظینِ قرآن کے سلسلہ کا ہی حصہ ہیں۔ ان الٰہی وجودوں نے اپنے اپنے ادوار میں حفاظت قرآن کی ڈیوٹی نبھائی۔ بلکہ حفاظتِ قرآن کے منکروں کو باآوازِ بلند چیلنجز بھی دیتے رہے۔ یہاں نمونۃً حضرت مصلح موعودؓ کا ایک اقتباس درج ہے۔ حضورؓ فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور یہ بات میں صرف عقیدۃً ہی نہیں مانتا بلکہ اس بات پر مجھے کامل یقین ہے اور یہ

یقین اس امر کا نتیجہ نہیں کہ میں مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا ہوں بلکہ اس یقین کی بناء دلائل اور عینی شواہد پر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر اس شخص کے اعتراضات کا جواب دے سکتا ہوں جو قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا منکر ہو خواہ وہ اعتراضات عقلی ہوں یا نقلی۔"

("اسلام پر پروفیسر رام دیو کے اعتراضات کا جواب" انوار العلوم جلد 5 صفحہ 365)

خدا تعالیٰ نے نزول قرآن سے لے کر آج تک اس کتاب کی ظاہری اور معنوی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا اس کے بکمال ایفاء کا حال تو ہمارے سامنے آگیا مگر اب بھی کسی کو اس قرآن کی حفاظت پر شبہ ہو تو وہ حضرت مسیح موعودؑ کے بیان فرمودہ اس انقلاب آفرین اصولِ علم الکلام کی رو سے پہلے اپنی الہامی کتاب کا محفوظ ہونا ثابت کرے۔ کیونکہ اس وقت تک کسی دوسرے کی طرف کوئی الزام منسوب کرنا ہرگز درست نہیں جب تک کہ وہی اعتراض خود اپنے پر پڑ رہا ہو۔ اس اصول کے مطابق کسی بھی اور کتاب کا ماننے والا قرآن کی ظاہری یا معنوی حفاظت و ثقاہت پر اعتراض نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل اسے اپنی کتاب کی حفاظت کا کم از کم وہ معیار ثابت کرنا ہو گا جو قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اور اس قدر اعلیٰ حفاظتی معیار والی اور حفاظت کے خدائی وعدوں کی حامل کتاب اس وقت روئے زمین پر صرف اور صرف قرآن حکیم ہی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آکر دلائل اور براہین کی قوت کے ساتھ عظمت و حفاظت قرآن کا دعویٰ فرمایا اس میں آپ کی عظیم الشان فتوحات کے نظارے وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتے رہے یہاں وقت کی رعایت کے ساتھ صرف ایک نشان کا ذکر کرنا کافی ہو گا۔ آپ علیہ السلام نے 20 ستمبر 1886ء کو ایک اشتہار مفید الاخیار دیا اور ساتھ انعام کا بھی اعلان کیا۔ اب آپ کی زندگی میں کوئی بھی اس انعام کو لیتا نظر نہیں آتا اور نہ آپ کے بعد کسی میں اس کو قبول کرنے کی ہمت ہے۔ جو بلاشبہ آپؑ کے دلائل کی فتح پر دالّ ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ قرآن کے مخالفین صرف اور صرف چند بے حقیقت اور لایعنی باتیں اٹھا کر قرآن کے متعلق اعتراضات کرتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں تو انہیں اس مندرجہ ذیل اقتباس کو اب پھر غور سے پڑھ لینا چاہیئے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"ہم اس بارہ میں قرآن شریف کے اصولوں کے منکرین کو ایک نیک صلاح دیتے ہیں اگر ان کو اصول اور تعلیماتِ قرآنی پر اعتراض ہو تو مناسب ہے کہ وہ اول بطور خود خوب سوچ کر دو تین ایسے بڑے سے بڑے اعتراض بحوالہ آیاتِ قرآنی پیش کریں جو ان کی دانست میں سب اعتراضات سے ایسی نسبت رکھتے ہوں جو ایک پہاڑ کو ذرّہ سے نسبت ہوتی ہے یعنی ان کے سب اعتراضوں سے ان کی نظر میں اقویٰ و اشد اور انتہائی درجہ کے ہوں جن پر انکی نکتہ چینی کی

پُر زور نگاہیں ختم ہو گئی ہوں اور نہایت شدت سے دوڑ دوڑ کر انہیں پر جا ٹھہری ہوں سو ایسے دو یا تین اعتراض بطور نمونہ پیش کر کے حقیقتِ حال کو آزما لینا چاہیئے کہ اس کے تمام اعتراضات کا با آسانی فیصلہ ہو جائے گا کیونکہ اگر بڑے اعتراض بعد تحقیق ناچیز نکلے تو پھر چھوٹے اعتراض ساتھ ہی نابود ہو جائیں گے اور اگر ہم ان کو کافی و شافی جواب دینے سے قاصر رہے اور کم سے کم یہ ثابت نہ کر دکھایا کہ جن اصولوں اور تعلیموں کو فریق مخالف نے بمقابلہ ان اصولوں اور تعلیموں کے اختیار کر رکھا ہے وہ ان کے مقابل پر نہایت درجہ رذیل اور ناقص اور دور از صداقت خیالات ہیں۔

تو ایسی حالت میں فریقِ مخالف کو درحالت مغلوب ہونے کے فی اعتراض پچاس روپیہ بطور تاوان دیا جائے گا۔ لیکن اگر فریق مخالف انجام کار جھوٹا نکلا اور وہ تمام خوبیاں جو ہم اپنے ان اصولوں یا تعلیموں میں ثابت کر کے دکھلا دیں بمقابل انکے وہ اپنے اصولوں میں ثابت نہ کر سکا۔ تو پھر اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اسے بلا توقف مسلمان ہونا پڑے گا اور اسلام لانے کے لئے اول حلف اٹھا کر اسی عہد کا اقرار کرنا ہو گا اور پھر بعد میں ہم اس کے اعتراضات کا جواب ایک رسالہ مستقلہ میں شائع کرا دیں گے اور جو اس کے بالمقابل اصولوں پر ہماری طرف سے حملہ ہو گا اس حملہ کی مدافعت میں اس پر لازم ہو گا کہ وہ بھی ایک مستقل رسالہ شائع کرے اور پھر دونوں رسالوں کے چھپنے کے بعد کسی ثالث کی رائے پر یا خود فریق مخالف کے حلف اٹھانے پر فیصلہ ہو گا جس طرح وہ راضی ہو جائے لیکن شرط یہ ہے کہ فریق مخالف نامی علماء میں سے ہو اور اپنے مذہب کی کتاب میں مادہ علمی بھی رکھتا ہو اور بالمقابل ہمارے حوالہ اور بیان کے اپنا بیان بھی بحوالہ اپنی کتاب کے تحریر کر سکتا ہو۔ تا ناحق ہمارے اوقات کو ضائع نہ کرے۔

اور اگر اب بھی کوئی نامنصف ہمارے اس صاف صاف منصفانہ طریق سے گریز اور کنارہ کر جائے اور بد گوئی اور دشنام دہی اور توہین اسلام سے بھی باز نہ آوے تو اس سے صاف ظاہر ہو گا کہ وہ کسی حالت میں بھی اس لعنت کے طوق کو اپنے گلے سے اتارنا نہیں چاہتا کہ جو خدا تعالیٰ کی عدالت اور انصاف نے جھوٹوں اور بے ایمانوں اور بدزبانوں اور بخیلوں اور متعصبوں کے گردن کا ہار کر رکھا ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔"

("سرمہ چشم آریہ" روحانی خزائن جلد 2 صفحہ 313، 314)

دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں قرآں کے گرد گھوموں کعبہ مرا یہی ہے

❁❁❁❁❁

بائبل اور قرآن

کیا حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 950 برس یا اس سے زائد تھی؟

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا۔(العنکبوت: 15)

اردو ترجمہ: اور یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ پس وہ ان میں نوسو پچاس برس رہا۔

بائبل میں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 950 سال بیان ہوئی ہے۔ جبکہ طبی اور آثاریاتی حوالوں سے انسان کی اتنی لمبی عمر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ پھر بائبل کے بارہ میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بائبل بعض باتوں میں مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے کام لیتی ہے لیکن حضرت نوحؑ کے حوالہ سے قرآنِ مجید میں بھی لکھا ہے فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا (یعنی حضرت نوحؑ اپنی قوم میں 950 سال رہے)۔ کیا یہ آپ کی حقیقی عمر ہے یا اس سے مراد کچھ اور ہے؟ زیرِ نظر مضمون میں اسی حوالہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون محترم شیخ عبد القادر صاحب مرحوم (محقق عیسائیت) کے اس موضوع پر لکھے گئے مضامین کا خلاصہ ہے جس کو مناسب تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتبہ: اے۔ آر۔ سدھو)

بائبل میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں کئی لوگوں کی عمر سینکڑوں سال بیان ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے بارہ میں لکھا ہے:

”آدم کی کل عمر نوسو تیس برس کی ہوئی تب وہ مرا۔“ (پیدائش باب 5 آیت 5)

حضرت آدمؑ کے ایک بیٹے سیت کے بارہ میں لکھا ہے:

"سیت کی **کل عمر نو سو بارہ برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 8)

اسی طرح حضرت آدمؑ کے پوتے اور سیت کے بیٹے انوس کے بارہ میں بائبل میں لکھا ہے:

"انوس کی **کل عمر نو سو پانچ برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 11)

اسی طرح آدم کی نسل سے آگے اور لوگوں کے بارہ میں بھی بائبل اسی طرح بیان کرتی ہے:

"قینان کی **کل عمر نو سو دس برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 14)

"محلل ایل کی **کل عمر آٹھ سو پچانوے برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 17)

"یارو کی **کل عمر نو سو باسٹھ برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 20)

"متوسلح کی **کل عمر نو سو انہتر برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 27)

حضرت نوحؑ کے والد لمک کی عمر کے بارہ میں بائبل میں لکھا ہے:

"لمک کی **کل عمر سات سو ستتر برس کی ہوئی** تب وہ مرا۔" (پیدائش باب 5 آیت 31)

اسی ضمن میں حضرت نوحؑ کی عمر کے بارہ میں بائبل میں لکھا ہے:

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا۔ اور **نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی** تب اس نے وفات پائی۔" (پیدائش باب 9 آیت 29,28)

بائبل کے ان بیانات سے عام طور پر مفسرینِ بائبل حضرت نوحؑ کی ظاہری عمر ہی مراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ میتھیو ہینری (Matthew Henry) کی معروف تفسیرِ بائبل میں پیدائش کی ان آیات کے تحت لکھا ہے:

"خدا نے نوح کو طویل عمر عطا کی۔ یہ طویل العمری اس کی ممتاز دینداری اور خدا پرستی کا اجر اور دنیا کے لیے بڑی برکت کا باعث تھی۔"[1]

بہرحال یہ سب بائبل کی مبالغہ آرائیاں ہیں کیونکہ طبعی لحاظ سے انسان کی عمر اتنی لمبی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی علمِ آثار قدیمہ سے اس بات کے کہیں سے بھی شواہد ملے ہیں کہ پرانے زمانے کے انسان سینکڑوں سال زندہ رہتے تھے۔ آج سے ہزاروں سال قبل کے انسان کی ہڈیاں دنیا کے تمام خطوں سے دریافت ہو چکی ہیں اور Dating technique سے

[1] تفسیر الکتاب۔ جلد اوّل۔ اردو ترجمہ میتھیو ہینری کامنٹری۔ چرچ فاؤنڈیشن سیمینارز۔ لاہور۔ 2002ء صفحہ 54 زیر آیت پیدائش باب 9 آیت 28 تا 29

ان کی عمر معلوم کی جاچکی ہے کسی جگہ سے بھی غیر معمولی عمر پانے کے شواہد نہیں ملے۔

لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں قرآنِ مجید میں بھی یہی ہے کہ آپ ان میں 950 سال رہے۔ جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں درج ہے:

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ۔(العنکبوت:15)

ترجمہ: اور یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ پس وہ ان میں نو سو پچاس برس رہا۔ پس ان کو طوفان نے آ پکڑا اور وہ ظلم کرنے والے تھے۔

مفسرین قرآن عام طور پر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 950 سال سے بھی زائد بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے گمان میں 950 سال تو حضرت نوحؑ ان میں رہے۔ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ تو طوفان اس کے بعد آیا۔ اور طوفان کے بعد بھی آپ زندہ رہے۔ چنانچہ تورات کے مطابق آپ طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔(پیدائش باب 9 آیت 28) لیکن تورات کے مطابق طوفان اس وقت آیا جب آپ کی عمر چھ سو سال کی تھی (پیدائش باب 7 آیت 11) اس طرح تورات کے مطابق آپ نے کل ساڑھے نو سو سال عمر پائی۔

جبکہ مفسرین قرآن کے مطابق 950 سال تو آپ کی بعثت کی عمر ہے طوفان سے پہلے۔ پھر طوفان کے بعد بھی آپ زندہ رہے اور بعثت سے پہلے بھی قوم میں کئی سال رہے۔ اس حوالہ سے مفسرین قرآن میں مختلف قیاس آرائیاں پائی جاتی ہیں۔ کسی نے آپ کی کل عمر 1050 سال کسی نے 1300 سال کسی نے 1600 اور کسی نے 1700 سال تک بھی بیان کی ہے۔ مثال کے طور پر تفسیر سے چند مثالیں پیش ہیں:

تفسیر طبری:

علامہ ابنِ جریر (838عیسوی تا 923عیسوی) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَذُكِرَ أَنَّهُ أُرْسِلَ إِلَىٰ قَوْمِهِ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثِ مِئَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً۔ كَمَا حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ، قَالَ: ثَنَا نُوحُ بْنُ قَيْسٍ، قَالَ: ثَنَا عَوْنُ بْنُ أَبِي شَدَّادٍ، قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَ نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ وَهُوَ ابْنُ خَمْسِينَ وَثَلَاثِ مِئَةٍ سَنَةٍ، فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، ثُمَّ عَاشَ بَعْدَ ذَلِكَ خَمْسِينَ وَثَلَاثَ مِئَةٍ سَنَةٍ۔۔

(جامع البیان عن تاویل القرآن المعروف تفسیر طبری لابن جریر طبری۔ جلد 19 و 20۔ دار احیا التراث العربی۔ بیروت۔ لبنان۔ 2001ء زیرِ آیت ہٰذا)

مفہوماً ترجمہ: اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ جب اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے اس وقت تین سو پچاس سال

کے تھے... عون بن ابی شدّاد کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے نوحؑ کو مبعوث کیا اس وقت وہ ساڑھے تین سو سال کے تھے۔ پھر وہ ان میں ساڑھے نو سو سال رہے پھر اس کے بعد (یعنی طوفان کے بعد) مزید ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔

تفسیر قرطبی:

علامہ قرطبی (1214عیسوی تا1273عیسوی)اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَاخْتُلِفَ فِي مَبْلَغِ عُمْرِهِ. فَقِيلَ: مَبْلَغُ عُمْرِهِ مَا ذَكَرَهُ اللهُ تَعَالَى فِي كِتَابِهِ. قَالَ قَتَادَةُ: لَبِثَ فِيهِمْ قَبْلَ أَنْ يَدْعُوَهُمْ ثلاث مائة سنة ودعاهم ثلاث مائة سَنَةٍ، وَلَبِثَ بَعْدَ الطُّوفَانِ ثَلَاثَ مِائَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: بُعِثَ نُوحٌ لِأَرْبَعِينَ سَنَةً، وَلَبِثَ فِي قَوْمِهِ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، وَعَاشَ بَعْدَ الْغَرَقِ سِتِّينَ سَنَةً حَتَّى كَثُرَ النَّاسُ وَفَشُوا. وَعَنْهُ أَيْضًا: أَنَّهُ بُعِثَ وهو ابن ميتين وَخَمْسِينَ سَنَةً، وَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ، وَعَاشَ بَعْدَ الطُّوفَانِ مِائَتَيْ سَنَةٍ. وَقَالَ وَهْبٌ: عُمِّرَ نُوحٌ أَلْفًا وَأَرْبَعَمِائَةِ سَنَةٍ. وَقَالَ كَعْبُ الْأَحْبَارِ: لَبِثَ نُوحٌ فِي قَوْمِهِ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، وَعَاشَ بَعْدَ الطُّوفَانِ سَبْعِينَ عَامًا فَكَانَ مَبْلَغُ عُمْرِهِ أَلْفَ سَنَةٍ وعشرين عاما. وَقَالَ عَوْنُ بْنُ شَدَّادٍ: بُعِثَ نُوحٌ وَهُوَ ابْنُ خَمْسِينَ وَثَلَاثِ مِائَةِ سنة، ولبث في قومه ألف سنة إلا خَمْسِينَ عَامًا، وَعَاشَ بَعْدَ الطُّوفَانِ ثَلَاثَ مِائَةِ سَنَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً. فَكَانَ مَبْلَغُ عُمْرِهِ أَلْفَ سَنَةٍ وَسِتَّ مِائَةِ سَنَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً وَنَحْوُهُ عَنِ الْحَسَنِ. قال الحسن: لَمَّا أَتَى مَلَكُ الْمَوْتِ نُوحًا لِيَقْبِضَ رُوحَهُ قَالَ: يَا نُوحُ كَمْ عِشْتَ فِي الدُّنْيَا؟ قَالَ: ثَلَاثُمِائَةٍ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، وَأَلْفُ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فِي قَوْمِي، وَثَلَاثُمِائَةِ سَنَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً بَعْدَ الطُّوفَانِ۔

(الجامع الاحکام القرآن لابی عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، مجلد الثانی، دار ابن حزم بیروت لبنان 2004 زیر آیت ہٰذا)

مفہوماً ترجمہ: حضرت نوحؑ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی کل عمر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ آپ اپنی قوم میں بعثت سے قبل تین سو سال تک رہے، پھر تین سو سال تک انہیں تبلیغ کرتے رہے اور پھر طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال رہے۔ اور طوفان کے بعد مزید ساٹھ سال زندہ رہے یہاں تک کہ لوگوں کی کثرت ہوگئی اور وہ پھیل گئے۔ ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ اس وقت مبعوث ہوئے جب ان کی عمر اڑھائی سو سال تھی اور وہ ان میں ساڑھے نو سو سال رہے اور طوفان کے بعد دو سو سال مزید زندہ رہے۔ وہب کہتے ہیں کہ نوحؑ چودہ سو سال زندہ رہے۔ کعب الاحبار کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ساڑھے

نو سو سال رہے، اور وہ طوفان کے بعد مزید ستر سال زندہ رہے اس طرح ان کی کل عمر ایک ہزار بیس سال تھی۔ عون بن شداد کہتے ہیں کہ نوحؑ ساڑھے تین سو سال کی عمر میں مبعوث ہوئے اس کے بعد ساڑھے نو سو سال اپنی قوم میں رہے۔ آپ طوفان کے بعد مزید ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ اس طرح ان کی کل عمر ایک ہزار چھ سو پچاس سال بنتی ہے۔

تفسیر ابن کثیر:

علامہ ابنِ کثیر (1301عیسوی تا1373عیسوی) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قَالَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: بُعِثَ نُوحٌ وَهُوَ لِأَرْبَعِينَ سَنَةٍ، وَلَبِثَ فِي قَوْمِهِ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، وَعَاشَ بَعْدَ الطُّوفَانِ سِتِّينَ عَامًا، حَتَّى كَثُرَ النَّاسُ وَفَشَوْا. وَقَالَ قَتَادَةُ: يُقَالُ إِنَّ عُمُرَهُ كُلَّهُ [كَانَ] أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، لَبِثَ فِيهِمْ قَبْلَ أَنْ يَدْعُوَهُمْ ثَلَثَمِائَةِ سَنَةٍ، وَدَعَاهُمْ ثَلَثَمِائَةٍ وَلَبِثَ بَعْدَ الطُّوفَانِ ثَلَثَمِائَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً. وَهَذَا قَوْلٌ غَرِيبٌ، وَظَاهِرُ السِّيَاقِ مِنَ الْآيَةِ أَنَّهُ مَكَثَ فِي قَوْمِهِ يَدْعُوهُمْ إِلَى اللَّهِ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا. وَقَالَ عَوْنُ بْنُ أَبِي شَدَّادٍ: إِنَّ اللَّهَ أَرْسَلَ نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ وَهُوَ ابْنُ خَمْسِينَ وَثَلَثِمِائَةِ سَنَةٍ، فَدَعَاهُمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا، ثُمَّ عَاشَ بَعْدَ ذَلِكَ ثَلَثَمِائَةٍ وَخَمْسِينَ سَنَةً. وهذا ايضاً غريب، رَوَاهُ ابنُ ابی حاتم و ابنُ جریر و قولُ ابنُ عباس اَقرب. واللہ اعلم

(تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر، مجلد السادس، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان 1998 زیر آیت ہٰذا)

مفہوماً ترجمہ: ... حضرت ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ چالیس سال کی عمر میں حضرت نوحؑ کو نبوت ملی اور نبوت کے بعد آپ نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کو تبلیغ کی اور طوفان کے بعد آپ مزید ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ یہاں تک کہ نسلِ انسانی پھیل گئی۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی کل عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی، تین سو سال تو آپ کے بغیر نبوت کے ان میں گزرے، پھر تین سو سال تک آپ ان کو تبلیغ کرتے رہے اور طوفان کے بعد آپ مزید ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ لیکن یہ قول غریب ہے۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے رہے۔ عون بن ابی شداد کہتے ہیں کہ بعثت کے وقت آپ کی عمر ساڑھے تین سو سال تھی۔ اس کے بعد ساڑھے نو سو سال آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہے۔ طوفان کے بعد پھر آپ نے مزید ساڑھے تین سو سال کی عمر پائی۔ اور یہ قول بھی غریب ہے، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جریر نے بھی نقل کیا ہے۔ اس حوالہ سے ابن عباس کا قول ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تفسیر در منثور:

علامہ جلال الدین سیوطی (1445عیسوی تا1505عیسوی) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أَخْرَجَ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وعَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ، وابْنُ المُنْذِرِ، وابْنُ أَبِي حاتِمٍ، وأَبُو الشَّيْخِ، والحاكِمُ وصَحَّحَهُ، وابْنُ مَرْدُوَيْهِ، عَنِ ابْنِ عَبّاسٍ قالَ: بَعَثَ اللهُ نُوحًا وهو ابْنُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، ولَبِثَ فيهم أَلْفَ سَنَةٍ إلّا خَمْسِينَ عامًا يَدْعُوهم إلى اللهِ، وعاشَ بَعْدَ الطُّوفانِ سِتِّينَ سَنَةً حَتّى كَثُرَ النّاسُ وفَشَوْا. وأَخْرَجَ عَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ عَنْ عِكْرِمَةَ قالَ: كانَ عُمُرُ نُوحٍ قَبْلَ أَنْ يُبْعَثَ إلى قَوْمِهِ وبَعْدَما بُعِثَ أَلْفًا وسَبْعَمِائَةِ سَنَةٍ. وأَخْرَجَ سَعِيدُ بْنُ مَنصُورٍ، وعَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ، وابْنُ المُنْذِرِ، وابْنُ أَبِي حاتِمٍ، عَنْ مُجاهِدٍ قالَ: قالَ لِي ابْنُ عُمَرَ: كَمْ لَبِثَ نُوحٌ فِي قَوْمِهِ؟ قُلْتُ: أَلْفَ سَنَةٍ إلّا خَمْسِينَ عامًا. قالَ: فَإنَّ مَن كانَ قَبْلَكم كانُوا أَطْوَلَ أَعْمارًا، ثُمَّ لَمْ يَزَلِ النّاسُ يَنْقُصُونَ فِي الأَخْلاقِ والآجالِ والأَحْلامِ والأَجْسامِ إلى يَوْمِهِمْ هَذا. وأَخْرَجَ ابْنُ جَرِيرٍ عَنْ عَوْنِ بْنِ أَبِي شَدّادٍ قالَ: إنَّ اللَّهَ أَرْسَلَ نُوحًا إلى قَوْمِهِ وهو ابْنُ خَمْسِينَ وثَلاثِمِائَةِ سَنَةٍ، فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إلّا خَمْسِينَ عامًا، ثُمَّ عاشَ بَعْدَ ذَلِكَ خَمْسِينَ وثَلاثَمِائَةِ سَنَةٍ۔

(الدر المنثور لامام جلال الدین السیوطی، الجزء السادس، دار احیا التراث العربی بیروت لبنان 2001 صفحہ 403، 404 زیر آیت ہٰذا)

مفہوماً ترجمہ: امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، الحاکم (جنہوں نے اس کی توثیق کی) اور ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی جبکہ آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ آپ لوگوں کے درمیان ساڑھے نو سو سال رہے۔ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہے۔ طوفان کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ عام ہو گئے۔ امام عبد بن حمید نے عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: نوح کی عمر بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد کی کل عمر ایک ہزار سات سو سال تھی۔ امام سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مجھ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں کتنا عرصہ رہے؟ میں نے کہا ساڑھے نو سو سال۔ فرمایا تم سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں ان کی عمریں لمبی تھیں۔ پھر لگاتار آج تک لوگوں کے اخلاق، عمروں، عقلوں اور جسموں میں کمی ہوتی رہی۔ امام ابن جریر نے عون بن ابی شداد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو جب ان کی قوم کی طرف مبعوث کیا تو ان کی عمر ساڑھے تین سو سال تھی، وہ ان کے درمیان ساڑھے نو سو سال رہے، پھر اس (طوفان) کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔

تفسیر روح المعانی:

علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (1802عیسوی تا1854عیسوی) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أَخْرَجَ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وعَبْدُ بْنُ حَمِيدٍ وابْنُ المُنْذِرِ وابْنُ أَبِي حاتِمٍ وابْنُ مَرْدَوَيْهِ والحاكِمُ وصَحَّحَهُ عَنِ ابْنِ عَبّاسٍ قالَ: بَعَثَ اللهُ تَعالى نُوحًا عَلَيْهِ السَّلامُ وهو ابْنُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، ولَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إلّا خَمْسِينَ عامًا يَدْعُوهم إلى اللهِ تَعالى وعاشَ بَعْدَ الطُّوفانِ سِتِّينَ سَنَةً حَتّى كَثُرَ النّاسُ وفَشُوا، وعَلى هَذِهِ الرِّوايَةِ يَكُونُ عُمُرُهُ عَلَيْهِ السَّلامُ أَلْفَ سَنَةٍ وخَمْسِينَ سَنَةً، وقِيلَ: إنَّهُ عَلَيْهِ السَّلامُ عَمَّرَ أَكْثَرَ مِن ذَلِكَ، أَخْرَجَ ابْنُ جَرِيرٍ عَنْ عَوْنِ بْنِ أَبِي شَدّادٍ قالَ: إنَّ اللهَ تَعالى أَرْسَلَ نُوحًا عَلَيْهِ السَّلامُ إلى قَوْمِهِ وهو ابْنُ خَمْسِينَ وثَلاثِمِائَةِ سَنَةٍ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إلّا خَمْسِينَ عامًا ثُمَّ عاشَ بَعْدَ ذَلِكَ خَمْسِينَ وثَلاثِمِائَةِ سَنَةٍ فَيَكُونُ عُمُرُهُ أَلْفَ سَنَةٍ وسِتِّمِائَةٍ وخَمْسِينَ سَنَةً، وأَخْرَجَ عَبْدُ بْنُ حَمِيدٍ عَنْ عِكْرِمَةَ قالَ: كانَ عُمُرُ نُوحٍ عَلَيْهِ السَّلامُ قَبْلَ أَنْ يُبْعَثَ إلى قَوْمِهِ وبَعْدَ ما بُعِثَ أَلْفًا وسَبْعَمِائَةِ سَنَةٍ، وعَنْ وهْبٍ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلامُ عاشَ أَلْفًا وأَرْبَعَ مِائَةِ سَنَةٍ، وفِي جامِعِ الأُصُولِ كانَتْ مُدَّةُ نُبُوَّتِهِ تِسْعَ مِائَةٍ وخَمْسِينَ سَنَةً وعاشَ بَعْدَ الغَرَقِ خَمْسِينَ سَنَةً، وقِيلَ: مِائَتَيْ سَنَةٍ وكانَتْ مُدَّةُ الطُّوفانِ سِتَّةَ أَشْهُرٍ آخِرُها يَوْمُ عاشُوراءَ۔

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم لشہاب الدین السید محمود الالوسی البغدادی، الجز التاسع عشر، دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان 1999 صفحہ:466 زیر آیت ہٰذا)

مفہوماً ترجمہ: ابنِ ابی شیبہ اور عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم ایک روایت لائے ہیں اور اس کو انہوں نے ابنِ عباس کی روایت سے درست قرار دیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت نوحؑ کو مبعوث فرمایا تو وہ چالیس سال کے تھے اس کے بعد وہ اپنی قوم کو اللہ کی طرف نو سو پچاس سال بلاتے رہے۔ پھر وہ طوفان کے بعد مزید ساٹھ سال زندہ رہے، یہاں تک کہ لوگوں کی کثرت ہوگئی اور وہ پھیل گئے۔ اس روایت کے مطابق حضرت نوحؑ کی کل عمر ایک ہزار پچاس سال بنتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اس سے بھی زیادہ عمر پائی۔ ابنِ جریر عون بن شداد سے ایک روایت لائے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ بعثت کے وقت حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے تین سو سال تھی۔ پھر وہ ان کو ساڑھے نو سو سال اللہ کی طرف بلاتے رہے۔ طوفان کے بعد بھی آپ نے ساڑھے تین سو سال مزید عمر پائی۔ اس طرح آپ کی کل عمر ساڑھے سولہ سو سال بنتی ہے۔ عبد ابنِ حمید نے عکرمہ سے روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی کل عمر بعثت سے قبل اور بعثت کے بعد ساڑھے سترہ سو سال بنتی ہے۔ اور وہب سے روایت ہے کہ آپ چودہ سو سال زندہ رہے اور جامع الاصول میں آپ کی نبوت کی عمر ساڑھے نو سو سال بیان ہوئی ہے اور طوفان کے بعد مزید پچاس سال آپ زندہ

رہے۔اور یہ بھی کہا گیاہے کہ مزید دو سو سال زندہ رہے اور طوفان کی مدت چھ ماہ تھی اور اس کا آخری دن یوم عاشورہ تھا۔

تفہیم القرآن از مودودی:

مودودی صاحب (1903عیسوی تا1979عیسوی)اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد سے طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے، اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری۔یہی چیز یہاں بیان کرنی مقصود ہے۔اہلِ ایمان کو بتایا جارہاہے کہ تم کو تو ابھی پانچ سات برس ہی ظلم و ستم سہتے اور ایک گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کرتے گزرے ہیں۔ذرا ہمارے اس بندے کے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کو دیکھو جس نے مسلسل ساڑھے نو صدیوں تک ان شدائد کا مقابلہ کیا۔حضرت نوحؑ کی عمر کے بارے میں قرآن مجید اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔بائیبل کا بیان یہ ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔وہ چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا۔اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے۔(پیدائش باب 7 آیت 6، باب 9 آیت 28 تا 29) لیکن قرآن کے بیان کی روسے ان کی عمر کم از کم ایک ہزار سال ہونی چاہیے۔کیونکہ ساڑھے نو سو سال تو صرف وہ مدت ہے جو نبوت پر مامور ہونے کے بعد سے طوفان برپا ہونے تک انہوں نے دعوت و تبلیغ میں صرف کی۔ظاہر ہے کہ نبوت انہیں پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی ملی ہوگی۔اور طوفان کے بعد بھی وہ کچھ مدت زندہ رہے ہوں گے۔یہ طویل عمر بعض لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔لیکن خدا کی اس خدائی میں عجائب کی کمی نہیں ہے۔جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے ،اس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آجاتے ہیں۔کچھ واقعات و حالات کا اولاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا واضح تصور اپنے ذہن میں رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے

بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔"
(تفہیم القرآن از ابو الاعلیٰ مودودی، جلد سوم، ترجمان القرآن لاہور 2008صفحہ 685،686)

مفہوم القرآن از غلام احمد پرویز:

غلام احمد پرویز صاحب(1903عیسوی تا1985عیسوی) اپنی تفسیر "مفہوم القرآن" میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:"اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کی عمر 200سال کی تھی۔سنۃ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک کے ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ہزار فصلوں کے اڑھائی سو سال ہوئے۔ ان میں سے 50سال نکال دیئے تو باقی دو سو سال رہ گئے یا یہ معنی بھی کہ ان کی عمر اڑھائی سو سال کی تھی جن میں سے 50سال (زمانہ قبل از نبوت) آرام کا زمانہ تھا۔اس کے بعد سختیوں کا زمانہ شروع ہو گیا۔ یہ بہر حال قیاسات ہیں جب تاریخی تحقیقات کسی یقینی نقطہ تک پہنچیں گی تو اس کا حتمی مفہوم سامنے آجائے گا۔" (مفہوم القرآن از غلام احمد پرویز، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور۔2011ء صفحہ 912زیر آیت ہٰذا)

البیان از جاوید احمد غامدی:

جاوید احمد غامدی صاحب اپنی تفسیر القرآن "البیان" میں اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

"حضرت نوح کی عمر کے بارے میں بائیبل کا بیان بھی یہی ہے۔پیدائش میں ہے:"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس ہوئی، تب اس نے وفات پائی۔"(9: 28تا29) بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط بالعموم یہی تھا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کے باپ کی عمر سات سو ستتر سال اور دادا کی نو سو انہتر سال مذکور ہے۔ اسی طرح ان کے دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ سال بتائی گئی ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے سال۔ ان بیانات کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خدا کا فیصلہ اگر ابتدا میں یہی رہا ہو۔ اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ہماری یہ زمین اس وقت آباد ہو رہی تھی اور اسے آباد رکھنے کے لیے غالباً یہی طریقہ موزوں بھی تھا۔"
(البیان۔ تفسیر القرآن از جاوید احمد غامدی۔ جلد4صفحہ 14تا15)

پس مندرجہ بالا تفاسیر سے واضح ہے کہ سوائے اہل قرآن غلام احمد پرویز کے باقی سب مفسرین نے سورۃ العنکبوت کی آیت وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا۔(العنکبوت:15) سے مراد حضرت نوحؑ کی حقیقی عمر ہی لی ہے۔ اہلِ قرآن بھی اس کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو سمجھ سے بالا ہے۔ نیز وہ اس حوالہ سے ابھی مزید تحقیقات کے متقاضی ہیں۔

بہر حال عام طور پر مفسرین 950سال تو آپ کا طوفان سے پہلے نبوت کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔40یا50سال کی

عمر میں آپ کا مبعوث ہونا بیان کرتے ہیں اور طوفان کے بعد بھی کئی سال تک آپ کا زندہ رہنا بیان کرتے ہیں۔ اس طرح مفسرین قرآن کے نزدیک آپ کی کل عمر 1050 یا 1300 یا 1600 یا بعض کے نزدیک 1700 سال تک تھی۔

قرآنی حوالہ سے حضرت نوحؑ کی حقیقی عمر 1000 سال یا اس سے زائد ماننے کے حوالہ سے مشکلات:

اب اگر حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 1050 سال، 1300 سال یا 1700 سال تصور کی جائے تو حضرت ابراہیمؑ سمیت کئی اور انبیاءؑ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی میں ماننے پڑیں گے۔ کیونکہ بائبل کی تقویم اور تاریخ انبیاء سے محققین عام طور حضرت آدمؑ کا زمانہ 4000 قبل مسیح متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کا زمانہ 3000 قبل مسیح اور حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ عام طور پر 2000 قبل مسیح متعین کیا جاتا ہے۔

مفسرین قرآن کی تشریح کے مطابق تو پھر حضرت ابراہیم حضرت نوحؑ کی زندگی میں ہی پیدا شدہ ماننے پڑیں گے۔ جیسا کہ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے 892 سال بعد پیدا ہوئے۔ (پیدائش باب 11 آیت 10 تا 26) اس حساب سے حضرت ابراہیمؑ نہ صرف حضرت نوحؑ کی زندگی میں پیدا ہوئے بلکہ وفات بھی حضرت نوحؑ کی زندگی میں ہی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ تورات میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ 175 برس کے ہو کر فوت ہوئے (پیدائش باب 25 آیت 7) جیسا کہ بعض مفسرین آپ کی عمر 1300 سال یا 1700 سال تک بھی بیان کرتے ہیں تو پھر تو آپ نے لازماً حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ بھی پایا ہو گا۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی اولاد حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کو بھی حضرت نوحؑ کی زندگی میں پیدا شدہ ماننا پڑے گا۔ اور یہ بات قرآن میں بیان تاریخ انبیاء کے صریح خلاف ہے۔ پس یہ ساری باتیں اگر مفسرین مدّ نظر رکھتے تو قرآنی آیات کی ایسی تشریح ہرگز نہ کرتے۔ کیونکہ یہ باتیں دیگر قرآنی آیات سے متصادم ہیں۔

قرآن حکیم نے واضح طور پر بتایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بہت سی قومیں پیدا ہوئیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا۔

سورۃ المومنون میں آیات 23 تا 30 میں حضرت نوحؑ اور طوفانِ نوح کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔ (المومنون :32)

ترجمہ: پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے زمانہ کے لوگ پیدا کر دیئے۔

پھر آگے ایک رسول کے آنے اور اس کی قوم کے جھٹلانے اور ہلاک ہونے کا ذکر ہے اس کے بعد پھر لکھا ہے:

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ۔ (المؤمنون :42)

ترجمہ: پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے زمانے والوں کو پیدا کیا۔

پھر اس کے بعد پے در پے رسولوں کے آنے اور ان کی اقوام کے ہلاک ہونے کا ذکر ہے:

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوۡلُہَا کَذَّبُوۡہُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَہُمۡ بَعۡضًا وَّ جَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ۔(المومنون :44)

ترجمہ: پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے، جب بھی کسی امت کی طرف اس کا رسول آیا انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ پس ہم ان میں سے بعض کو بعض دوسروں کے پیچھے لائے۔ پھر ہم نے انہیں قصے کہانیاں بنا دیا۔ پس لعنت ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لاتے۔ اس سارے بیان میں حضرت نوحؑ کے بعد مختلف اقوام کے پیدا ہونے اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کے باعث تباہ ہونے کا ذکر ہے، لیکن کہیں بھی حضرت نوحؑ کے غیر معمولی عمر پانے کا ذکر نہیں۔

پھر سورۃ الصّٰفّٰت میں طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی ذریت کے باقی رہنے کا ذکر ہے، حضرت نوحؑ کی بقا کا کہیں ذکر نہیں۔ چنانچہ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے:

وَ لَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِیۡبُوۡنَ ﴿۷۶﴾ۖ وَ نَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۷﴾ۖ وَ جَعَلۡنَا ذُرِّیَّتَہٗ ہُمُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۷۸﴾ۖ وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡہِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۷۹﴾ۖ سَلٰمٌ عَلٰی نُوۡحٍ فِی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۰﴾ (الصّٰفّٰت: آیت 76 تا 80)

ترجمہ: اور یقیناً ہمیں نوح نے بھی پکارا تھا اور ہم بڑا اچھا جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اس کو بھی اور اس کے اہل کو بھی بڑی گھبراہٹ سے نجات دی تھی اور ہم نے اس کی اولاد کو ہی دنیا میں باقی رکھا تھا اور اس کے بعد آنے والی قوموں میں اس کا ذکرِ خیر قائم رکھا تھا۔ تمام قوموں کی طرف سے نوح پر سلامتی کی دعا ہو رہی ہے۔

آگے چل کر ذکر ہے: وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ ۔(الصّٰفّٰت : آیت 84) ترجمہ: اور یقیناً اس کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔[1]

---

[1] جب حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تو اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت چل رہی تھی۔ پھر جب آپ بڑے ہوئے تو آپ کو اپنی شریعت عطا ہوئی جس کا ذکر صُحُفِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی ۔(الاعلیٰ:20) میں ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ اپنی ترجمۃ القرآن کلاس میں فرماتے ہیں:

”حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 950 سال بیان ہوئی ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا: وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ اور ابراہیم اس کی شریعت پر تھا۔ اور ساتھ ابراہیم کی شریعت کا بھی بعد میں ذکر ملتا ہے، جب ابراہیم بڑا ہوا ہے تو ان کو اپنی شریعت عطا کی گئی۔“

(ٹرانسکرپشن از اردو ترجمۃ القرآن کلاس حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ۔ سورۃ العنکبوت آیت:15 کلاس نمبر 204)

ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام کی زندگی میں حضرت ابراہیمؑ پیدا نہیں ہوئے بلکہ آپ کے بعد آپ کی ذریت میں پیدا ہوئے۔

پھر سورۃ الانعام میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے عطا ہونے کے ذکر کے بعد ان سب کو ہدایت دینے کا ذکر ہے اور ساتھ ان سے قبل حضرت نوحؑ کو ہدایت دینے کا ذکر ہے:

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ... (الانعام: 85)

ترجمہ: ہم نے اس کو (یعنی ابراہیمؑ کو) اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ہم نے (ان) سب کو ہدایت دی تھی اور **اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی تھی۔**

وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ سے ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی وفات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نہیں ہوئی بلکہ بہت پہلے ہو چکی تھی۔

سورہ نساء میں فرمایا:

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔(النساء : 164)

ترجمہ: یقیناً ہم نے تمہاری طرف ویسے ہی وحی بھیجی جیسے ہم نے **نوح اور اس کے بعد** پیغمبروں کی طرف بھیجی اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی فرمائی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔

مذکورہ بالا آیت میں حضرت نوحؑ کے بعد مختلف پیغمبروں کی طرف وحی کا ذکر ہے اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کی طرف وحی کا ذکر ہے یعنی حضرت نوحؑ کے بعد والے پیغمبروں میں حضرت ابراہیمؑ بھی شامل ہیں۔

پس اگر حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 1050، 1300، 1600 یا 1700 برس تھی تو ماننا پڑے گا کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور دیگر انبیاء علیہم السلام سب کے سب ان کی زندگی میں آئے بعد میں آنے والے نہیں ہو سکتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر اگر 1700 سال فرض کر لی جائے تو ماننا ہو گا کہ نوحؑ سے لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ تک کے سب پیغمبر آپ کی زندگی میں مبعوث ہوئے تھے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں ہے کہ وہ سب نوحؑ کے بعد آئے۔ متشابہات کو محکمات کے تابع رکھنا ہو گا۔ محکم بات یہی ہے کہ نوحؑ کے بعد باقی پیغمبر آئے ہیں نہ کہ زندگی میں۔ الغرض قرآنی تقویم ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اتنی لمبی عمر فرض کر لی جائے۔

لَبِثَ فِیۡھِمۡ کا دیگر قرآنی آیات کی رُو سے صحیح مفہوم:

اب آیئے زیر نظر آیتِ قرآنی پر غور کریں فرمایا:

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡھِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا۔(العنکبوت : 15)

ترجمہ: اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا پس وہ ان میں نو سو پچاس سال تک رہے۔

تورات میں لکھا ہے: "اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا۔ اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی تب اُس نے وفات پائی۔" (پیدائش باب 9 آیت 28 تا 29)

تورات میں نوحؑ کی عمر اور وفات کا ذکر ہے قرآن حکیم میں محض لَبِثَ فِیۡھِمۡ ہے، یعنی اُن میں رہا۔ قرآنی اسلوب کی رُو سے لَبِثَ کے معنے صرف رہنے کے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ لَبِثَ سے مراد ذاتی زندگی ہی ہو۔ مرنے کے بعد بھی رہنے پر یہ مادہ مستعمل ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

فَلَوۡ لَاۤ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِیۡنَ ۔ لَلَبِثَ فِیۡ بَطۡنِہٖۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ۔(الصّٰفٰت:144،145)

ترجمہ: اگر یونس تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو اس مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک پڑا رہتا۔

سورۃ الروم میں ہے:

لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ اِلٰی یَوۡمِ الۡبَعۡثِ۔(الروم: 57)

ترجمہ: تم اللہ کے حساب میں دُنیا میں یوم بعث تک رہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں لَبِثَ کا لفظ زندہ یا مردہ دونوں صورتوں میں پڑے رہنے کے لئے آیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو برس رہے۔ یہاں ضروری نہیں کہ یہ مراد ہو کہ وہ زندہ رہے تھے بلکہ نبوت اور شریعت کا دور مراد ہے جو کہ وفات کے بعد خلفاء کے ذریعہ ممتد ہو جاتا ہے۔

ایک پیغمبر کے متعلق وارد ہوا ہے بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ۔(البقرہ:260) یعنی یہاں بھی زندگی مراد نہیں بلکہ سو سالہ کشفی دورِ ممات مراد ہے۔

اصحاب کہف کے بارہ میں وارد ہوا کہ وَ لَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ۔(الکھف: 26) میں بھی تین صدیوں پر مشتمل دور مراد ہے۔

اسی طرح اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا عَشۡرًا۔(طٰہٰ: 104) میں دس صدیوں کا دور مراد ہے۔

الغرض مطلق لَبِثَ فِیۡہِمۡ سے یہ مراد نہیں ہو سکتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر اس وقت 950 برس تھی۔ اگر عمر ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ۔(یونس: 17) اور لَبِثۡتَ فِیۡنَا مِنۡ عُمُرِکَ سِنِیۡنَ۔(الشعراء: 19) کی طرح لَبِثَ کے ساتھ عُمُرًا کا لفظ زائد ہوتا۔ چونکہ قرآن حکیم میں لَبِثَ فِیۡہِمۡ ہے اس کے ساتھ عمر کی تخصیص نہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہاں دور نبوت یا شریعت مراد ہے نہ کہ ذاتی عمر۔

چنانچہ حضرت مصلح موعودؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”اس آیت میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ... نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال رہے اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس رہنے کے معنے روحانی رہنے کے ہیں یعنی نوحؑ کی تعلیم اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک رہی پھر مٹ گئی۔“

(تفسیر کبیر جلد 10 صفحہ 360 زیر آیت سورۃ العنکبوت:15)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیت پر اپنے ترجمۃ القرآن اردو میں مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے:

”حضرت نوحؑ کی عمر جو 950 سال بیان فرمائی گئی ہے اس سے ظاہری عمر مراد نہیں بلکہ آپؑ کی شریعت کی عمر ہے۔“

(قرآن کریم۔ اردو ترجمہ از حضرت مرزا طاہر احمد رحمہ اللہ صفحہ 687 نوٹ زیرِ آیت العنکبوت:15)

فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ:

اس موقع پر ایک ابہام کا ازالہ ضروری ہے۔

پہلے آیت درج ذیل ہے:

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۵﴾ فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَۃِ وَ جَعَلۡنٰہَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔(العنکبوت: 15،16)

اس آیت سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ طوفان کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 950 سال تھی کیونکہ پہلے ذکر ہے فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا (یعنی آپؑ ان میں 950 سال رہے)۔ اس کے بعد ذکر ہے فَاَخَذَہُمُ الطُّوۡفَانُ (یعنی پھر انہیں طوفان نے آپکڑا) ۔ اس سے مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ طوفان کے ذکر سے پہلے 950 سال رہنے کا ذکر ہے اس لیے طوفان سے پہلے آپ کی عمر 950 سال تھی یا طوفان سے پہلے بعثت کی عمر 950 سال تھی۔

اس آیت میں فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ سے مفسرین نے غلط نتیجہ نکالا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم درج ذیل ہے:

ترجمہ: اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا پس وہ ان میں (اپنی شریعت کے ذریعہ) نو سو پچاس سال تک رہا۔ سو (ہوا یوں کہ) اس کی قوم کے لوگوں کو طوفان نے آلیا اور وہ ظالم تھے۔ پس ہم نے اس کو اور اس کی کشتی میں بیٹھنے والے ساتھیوں کو نجات دی اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان کے لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

گویا پہلے یہ ذکر فرمایا کہ نوح کا دور 950 سال تک ممتد رہا ہے۔ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ سے اس قوم کی تاریخ بیان کی ہے۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جنہیں طوفان نے آلیا تھا جس سے مومنین بچا لئے گئے۔

اسی قسم کا اسلوب قرآن حکیم میں اور جگہ بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں ہے:

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۸﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۹﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۶۰﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ۔ (الشعراء: 58 تا 62)

ترجمہ: تب ہم نے آلِ فرعون کو باغوں، چشموں، خزانوں اور عزت والے ملک سے نکال دیا۔ ایسا ہی ہوا اور ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا۔ <u>**پھر صبح کے وقت وہ (یعنی فرعون اور آل فرعون بنی اسرائیل کو روکنے کے لئے) ان کے پیچھے چل پڑے۔ پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے۔**</u>

ان آیات میں پہلے معرکہ حق و باطل بنی اسرائیل اور فرعون کی آویزش کا نتیجہ بتا دیا یعنی انہیں باغوں، چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک سے نکال دیا پھر فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ (یعنی انہوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا صبح کے وقت) میں تفصیل بیان ہونا شروع ہوئی۔ اب یہاں بھی نتیجہ پہلے بیان ہو گیا اور واقعات کی تفصیل بعد میں آئی ہے۔ پس کلمہ ”ف“ ضروری نہیں کہ ہر جگہ تاریخی ترتیب کے لئے آئے بلکہ گزشتہ واقعات کے تسلسل کو قائم کرنے کے لئے رابطہ کی خاطر بھی آتا ہے۔ حکیمانہ کلام میں پہلے کسی واقعہ کا نتیجہ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً کولمبس روانہ ہوا اور اُس نے امریکہ دریافت کر لیا۔ اب رابطہ کے لئے کلمہ فَ آئے گا اور کولمبس کی مہم کی تفصیل بیان ہو گی۔ بالکل یہی اسلوب حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر میں ہمیں ملتا ہے:

”اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا پس وہ ان میں نو سو پچاس سال تک رہا۔“

اس کے بعد فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ سے اصل قصّہ اور اس کی تفصیل بیان کر دی گئی۔ یہ ایک حکیمانہ انداز ہے جس میں کام اور اس کا نتیجہ پہلے بیان کر دیا جاتا ہے اور واقعہ کی تفصیل بعد میں۔

اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے:

وَ کَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا۔(الاعراف: 5)

ترجمہ: اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ **سو ہمارا عذاب اُن پر رات کے وقت آیا۔**

یہاں بھی "فَ" ترتیب کے لئے نہیں بلکہ رابطہ کے لئے ہے۔ بستیوں کی ہلاکت جو عذاب کا نتیجہ ہے پہلے بیان ہو گئی اور عذاب جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئیں اس کا ذکر بعد میں ہے درمیان میں کلمہ "فَ" ہے۔ پس یہ لازمی نہیں کہ فَ ہر حال میں تاریخی ترتیب کے لئے آتا ہے۔ پہلے بیان کو جوڑنے کے لئے بھی آتا ہے جسے اصطلاح میں ترتیب بیان کہتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر میں پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اور اس کی برکات کے ممتد ہونے کا ذکر ہے پھر طوفان کی تفصیل ہے اور مومنین کے بچائے جانے کا ذکر ہے۔ فَاَخَذَھُمُ الطُّوۡفَانُ میں کلمہ "ف" پہلے بیان کو جوڑنے کے لئے آیا ہے۔

لَبِثَ فِیۡہِمۡ سے اگر حضرت نوحؑ کا دُور شریعت یا نبوت مراد ہے تو قرآن میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کے دور کا ہی کیوں ذکر کیا گیا کسی اور نبی کا کیوں نہیں کیا گیا؟:

اس ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر لَبِثَ فِیۡہِمۡ سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی عمر نہیں ان کا دور نبوت ہے تو اس میں حضرت نوحؑ کی کیا خصوصیت ہے ہر نبی کا ایک دور ہوتا ہے صرف حضرت نوحؑ کے لئے یہ کیوں وارد ہوا کہ وہ اپنی قوم میں 950سال تک رہے؟

تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب مذاہبِ عالم کے اختلافات میں حکم بن کر نازل ہوئی۔ سینکڑوں سال گزرنے کے بعد نوح کی قوم جب دوبارہ دیوتاؤں کو پوجنے لگی تو انہوں نے رزمیہ نظموں کی صورت میں طوفانِ نوح کے قصہ ٔ پارینہ کو دہرایا۔ سُمیری الواح میں طوفانِ نوح کا قصہ بیان کیا گیا۔ نوح کے نام کی بجائے صاحبِ سفینہ کو ذُوسدرا(Ziusudra) کے لقب سے پکارا گیا۔ چنانچہ ان الواح میں ہے کہ طوفان کے بعد صاحبِ سفینہ اپنی رفیقۂ حیات سمیت دِلْمون (یعنی جنتِ ارضی) میں بس گیا۔ اور یوں اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو گئی۔[1] تورات میں لکھا ہے کہ نوحؑ کی عمر950سال تھی۔

---

[1]S.H.Hooke, *Middle Eastern Mythology* Penguin Books Australia.1963.p.31

گویا کسی نے نوحؑ کو حیاتِ جاوید پانے والا بنادیا اور کسی نے غیر معمولی عمر پانے والا۔ قرآن حکیم نے متعدد آیات میں یہ واضح کیا ہے کہ حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کے انبیاء حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی میں نہیں آئے بلکہ اُن کی وفات کے بعد آئے ہیں۔مِنۡ قَبۡلُ ،وَمِنۡ بَعۡدِہٖ کے الفاظ میں اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے بعد اور حضرت ابراہیمؑ سے قبل متعدد پیغمبر آئے ہیں۔ یہ محکم آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے بہت عرصہ قبل حضرت نوحؑ فوت ہو چکے تھے۔ گویا قرآن حکیم نے اشارہ فرمادیا کہ اہل بابل کا یہ خیال صحیح نہیں کہ حضرت نوحؑ زندہ جاوید ہیں۔ نیز یہ حکیمانہ اشارہ بھی فرمایا کہ تورات کی وہ تقویم بھی غلط ہے جس کی رُو سے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کے دور میں زندہ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ حضرت نوحؑ کی عمر نہیں بلکہ اُن کا لَبِث 950 سال کا تھا۔لَبِث کے لئے قرآنی آیات میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اس کے لئے زندہ رہنا ضروری نہیں۔ حیات وممات پر مشتمل دور کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔یعنی آپ اپنی تعلیم اور شریعت کے لحاظ سے ان میں 950 سال رہے۔

اس اسلوب سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن حکیم نے اہل بابل اور اہل کتاب کے نظریات کی طرف حکیمانہ اشارہ کیاہے کہ وہ صحیح نہیں ہیں۔ گویا یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ عمر نوحؑ کے متعلق اساطیرِ مذاہب میں اختلاف موجود تھا۔ ضروری تھا کہ صحیح بات پیش کر دی جائے۔

حرفِ آخر

سورہ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔(آل عمران:7)یعنی قرآنِ مجید میں دو طرح کی آیات ہیں ایک محکمات جو واضح اور اپنے مفاہیم کے لحاظ سے عام فہم ہیں دوسری متشابہات جو اپنے مفاہیم کے لحاظ سے کسی قدر لطیف ہوتی ہیں یا ان میں کسی بارہ میں اجمالاً ذکر ہوتا ہے۔ ایسی آیات کو سمجھنے کے لیے محکم آیات کا سہارا لینا پڑتا ہے ورنہ ایسی آیات سے جو معانی ظاہری طور پر لیے جاتے ہیں وہ دیگر قرآنی آیات کے معانی سے متصادم ہوتے ہیں۔اور اس طرح قرآن میں تناقض ماننا پڑتا ہے جو کہ کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ایسی آیات کو اگر محکم آیات کے تحت رکھ کر معانی کئے جائیں تو بات واضح بھی ہو جاتی ہے اور قرآن میں کسی قسم کا تناقض نہیں رہتا۔

چنانچہ حضرت مسیحِ موعودؑ اس حوالہ سے ’’آئینہ کمالاتِ اسلام‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’قرآنِ کریم کی کسی آیت کے ایسے معنے کرنے چاہیے کہ جو صدہا دوسری آیات سے جو اس کی تصدیق کے لیے کھڑی ہوں مطابق ہوں اور دل مطمئن ہو جائے اور بول اٹھے کہ ہاں یہی منشاء اللہ جلشانہٗ کا اس کے پاک کلام میں سے یقینی طور سے ظاہر ہوتا ہے۔‘‘

(’’آئینہ کمالاتِ اسلام‘‘ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 229)

اسی طرح اپنی تصنیف ’’آریہ دھرم‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’یاد رہے کہ کسی قرآنی آیت کے معنے ہمارے نزدیک وہی معتبر اور صحیح ہیں جس پر قرآن کے دوسرے مقامات بھی شہادت دیتے ہوں کیونکہ قرآن کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں۔‘‘

(’’آریہ دھرم‘‘ روحانی خزائن جلد 10 صفحہ 86 حاشیہ)

اسی طرح ’’حقیقۃ الوحی‘‘ میں اس حوالہ سے فرماتے ہیں:

’’قرآنِ شریف میں عادت اللہ ہے کہ بعض جگہ تفصیل ہوتی ہے اور بعض جگہ اجمال سے کام لیا جاتا ہے، اور پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ مجمل آیتوں کے ایسے طور سے معنی کرے کہ آیات مفصلہ سے مخالف نہ ہو جائیں۔‘‘

(’’حقیقۃ الوحی‘‘ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 173 حاشیہ)

’’متشابہات کی یہ علامت ہے کہ ان کے ایسے معنی ماننے سے جو مخالف محکمات کے ہیں فساد لازم آتا ہے اور نیز دوسری آیات سے جو کثرت کے ساتھ ہیں مخالف پڑتی ہیں، خدا تعالیٰ کے کلام میں تناقض ممکن نہیں اس لیے جو قلیل ہے بہر حال کثیر کے تابع کرنا پڑتا ہے۔‘‘

(’’حقیقۃ الوحی‘‘ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 175)

پس حضرت نوحؑ کی عمر بھی ایک متشابہ امر ہے اسے محکم آیاتِ قرآنیہ کے تابع رکھ کر ہی درست تفسیر ہو سکتی ہے۔ محکم آیات میں ہے کہ عاد خلفاء (جانشین) قوم نوحؑ تھے۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ۔(الاعراف: 70)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اس نے نوح کی قوم کے بعد تمہیں جانشین بنایا تھا۔

سورۃ توبہ میں قوم نوح وعاد وثمود کے بعد قوم ابراہیم کا ذکر ہے۔

اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ۙ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰہِیۡمَ ...(التوبہ: 70)

ترجمہ: کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے **(یعنی) نوح، عاد، ثمود اور قوم ابراہیم** کی

مذکورہ آیت میں قوم عاد اور ثمود کو قوم نوح کی ذیل میں رکھا ہے اور قوم ابراہیم کا اس کے بعد ذکر ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعراف آیت 70 میں قوم عاد کو قومِ نوح کا جانشین قرار دیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت اپنے تابع انبیاء کے ذریعہ قوم عاد اور ثمود میں بھی جاری رہی اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا دور آیا۔ درمیانی پیغمبر حضرت نوحؑ کے بعد اور حضرت ابراہیمؑ سے قبل آئے جیسا کہ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ...(النساء: 164) اور نُوۡحًا ہَدَیۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ... (الانعام: 85) سے ثابت ہے۔

پس فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا۔ (العنکبوت: 15) یعنی آپ ان میں 950 سال رہے، سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کی عمر ہے اس کے علاوہ دیگر مفاہیم قرآنی اُسلوب اور دیگر محکم آیات کے خلاف ہیں۔

نیز کسی انسان کا اتنی لمبی عمر پانا آثارِ قدیمہ (Archaeology) کی سائنس اور حیاتیاتی سائنس (Biological Science) کے بھی خلاف ہے کیونکہ نہ تو آثارِ قدیمہ سے مختلف زمانوں کے انسانوں کی ہڈیوں سے اس بات کا کوئی ثبوت ملا ہے کہ کسی زمانہ کے انسان اتنا لمبا عرصہ زندہ رہتے تھے دوسرا حیاتیاتی سائنس کی رو سے بھی انسان کے جسم میں اتنا لمبا عرصہ زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں۔

پس مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہے کہ اس زمانہ کے حکم عدل حضرت مسیحِ موعودؑ کے علمِ کلام کی روشنی میں آج جماعت احمدیہ ہی ہے جو قرآنِ مجید کی ایسی تفسیر اور تشریح پیش کرتی ہے جو قرآنی اُسلوب کے مطابق ہے اور قرآنِ مجید کو مستشرقین کے اعتراضات سے بچانے والی ہے۔ جماعتِ احمدیہ کے علاوہ دیگر مسلمان فرقوں کی تفسیر ایسی ہے جس پر عقلیت پسندوں (Rationalist) اور مستشرقین کی طرف سے ایسے اعتراضات وارد ہوتے ہیں جن کا جواب دینا مشکل ہے۔

❁❁❁❁❁

ردّ دہریت

قسط اوّل:

زمین پر زندگی کی ابتداء اور خدا کا "ہاتھ"

(وسیمہ اُپل صاحبہ (آسٹریلیا) بنت پروفیسر چوہدری رحمت علی مسلم صاحب (مرحوم))

یوں تو تمام نظام کائنات ہی خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے اور کوئی بھی عقلمند انسان اس ترتیب اور ابلغ اور محکم نظام کو دیکھ کر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس کا نظام کسی مدبر اور بہت لطیف و خبیر ہستی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن **اس نظام میں سے زندگی کا کرۂ زمین پر موجود ہونا خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک ایسا ناقابل تردید ثبوت ہے جو ہر غور اور فکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی ہستی کی طرف لے جا سکتا ہے۔** بد قسمتی سے دہریت کے حامی اس نہایت خوبصورت دلیل ہستی باری تعالیٰ کو ایک اندھے ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسا اتفاق جو کائنات کی بے ترتیبی اور اندھا دھند پھیلاؤ کے نتیجہ میں ظہور میں آیا۔ زیر نظر مضمون ایسی ہی سوچ کا ایک محققانہ جواب ہے جس میں بالتفصیل اس نظریہ کی نفی کی گئی ہے۔

آج ہمیں کرۂ ارض پر بہت سی انواع واقسام کی زندگی نظر آتی ہے، سمندروں اور جھیلوں میں دریاؤں اور تالابوں میں گرم اُبلتے چشموں میں، مٹی کے اندر، زمین کے اوپر وادیوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر یہاں تک کہ poles کی جمی ہوئی برف کے نیچے بھی زندگی کا وجود نظر آتا ہے۔ زندگی کی یہ اقسام اتنی زیادہ ہیں کہ گنی نہیں جا سکتیں مگر Biologists کا اندازہ ہے کہ کئی لاکھ طرح کی زندگی کرۂ ارض پر پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ یہ زندگی (یعنی living organisms) بہت orderly اور well organised ہیں۔ ان میں کچھ بھی بے ترتیب نہیں۔ زندگی کے علم کو Biology کہتے ہیں۔ ایک Biologist ماہرِ حیاتیات کا کام ہے کہ اس خوبصورت زندگی کا غور سے مطالعہ

کرے اور سوچے کہ:

- یہ زندگی کس طرح وجود میں آئی؟
- اس کو بننے میں کن عوامل نے کام کیا کہ اتنا حسین Chemical ارتقاء ہوا۔ کس طرح سادہ اور simple عناصر (elements) سے پہلے inorganic molecules بنے اور پھر Carbon کے ساتھ مختلف طریقوں سے جُڑ کر organic molecules بن گئے؟
- پھر کس طرح بڑی ترتیب اور صحیح طریقے سے یہ molecules ایک دوسرے سے مل کر بڑے مرکبات یعنی compounds بنے؟
- اس کے بعد کیسے ان مرکبات نے بڑی precision سے خود کو organize کر لیا کہ زندگی کی اکائی (Unit) یعنی cell وجود میں آیا؟
- پھر اس Cell سے اور بہت سی اقسام بنیں اور کس طرح سمندر اس life سے active ہو گئے؟
- اگلے مرحلے میں کس طرح ان مختلف cells کی evolution کا ایک طویل عمل چلتا رہا جو کم و بیش

3.5 بلین سال پر محیط ہے اور کس طرح آج سے 600 ملین سال پہلے اتنی مختلف قسم کی اور بے شمار life سے یہ زمین بھر گئی جو ہمیں آج دکھائی دیتی ہے۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئی جس سے زمین کی کایا ہی پلٹ گئی اور وہ بے رونق، بے جان کرہ سے ایک پر رونق اور جاندار چیز بن کر کائنات میں ممتاز ہو گئی۔ سائنس دان اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں اس بارہ میں کوئی شک نہیں کہ زمین پر آج سے 4 بلین سال قبل صرف simple جاندار یعنی Unicellular life ہی تھی اور ایسی Life کے ہی 3.5 بلین سال پرانے fossils ملتے ہیں یہ evolution بہت جلد ہو گئی اس کے بارے میں آگے بیان کیا جائے گا۔ لیکن ارتقاء کا دوسرا دور یعنی Unicellular سے Multicellular کا بننا اور بہت سی variety کے living organisms کا وجود میں آنا زیادہ complex ہے۔ اسی لئے اس ارتقاء کو 3.5 بلین سال لگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ individual species کو بننے کے لئے ایک طویل دور سے گزرنا پڑا جس کی بہت سی stages تھیں جس کے لئے ایک programing system کام کر رہا تھا اور اُس کو چلانے کے لئے بہت ہی درست (precise) اور صحیح ترتیب رکھنے والی (orderly) information چاہیئے تھی جو اُسکو بنانے اور پھر چلانے کے لئے ضروری تھی۔ یہ genetic information ایک cell کے level پر بھی کام کرتی ہے اور individual کے لیول پر بھی اور اُس جاندار کی "کتابِ زندگی" ہے جو اُسکی نسل میں قریباً اُسی طرح آگے چلتی ہے۔ یہ کتاب اُسے شناخت (identity) دیتی ہے اور اسے

DNA کہتے ہیں۔ اس کے بننے کا معجزہ زندگی کے شروع ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی تفصیل بھی اپنے متعلقہ topic کے تحت discuss ہو گی۔

بہر حال یہ instructions جو ہر individual کے لئے Unique ہوتی ہیں اُس کے DNA میں لکھ دی گئی ہیں (یعنی they are encoded in the DNA) اس DNA کی ایک ایک Unit جو ایک قسم کا کام کرتی ہے اُسے gene کہتے ہیں مثلاً انسانی جسم میں DNA کا وہ حصہ جو insulin بناتا ہے یعنی insulin کی کیمسٹری کے لئے اس کے codes مہیا کرتا ہے وہ insulin کی gene کہلاتی ہے۔

تمام جانداروں (پودے اور جانور) میں اُن کے (structure) اور (function) یعنی individuality کے مطابق genes کام کرتی ہیں جب ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر ایک اپنی ذات میں ایک دنیا (world) نظر آتا ہے۔ اس عمل کے لئے تمام قسم کے پودوں اور جانوروں کو، ایک چھوٹے سے cell کے لیول سے لے کر ایک individual تک، سبھی کو توانائی کی ضرورت ہے۔ یہ توانائی انہیں food سے ملتی ہے اور ہم ان کو living organisms یعنی "جاندار" کہتے ہیں۔ انہی جانداروں کا علم حیاتیات یا Biology ہے اور اسی حیاتیات کا ایک میدان، زندگی کا شروع ہونا اور درجہ بدرجہ ترقی کرنا ہے۔

پس ارتقا کے اس عمل کو(یعنی cell کا بننا اور پھر تمام life کا وجود میں آنا) سمجھنے کے لئے ہمیں ماضی میں بہت پیچھے جانا ہو گا تا کہ معلوم کر سکیں کہ جب یہ زمین بنائی گئی اور نظامِ شمسی میں بالکل درست جگہ پر رکھی گئی تو اس پر کون سے حالات آتے رہے، اس پر کون سے عوامل کارفرما ہوئے، اسکی geochemistry کس طرح تبدیل ہوئی اور اسے کیسے درست کیا گیا؟ کرۂ ارض کی ہیئت صدیوں، بلکہ کروڑوں، اربوں سالوں تک بدلتی رہی۔ اس پر زندگی کی ابتدا کرنے کے لئے کائنات میں تیاری کی گئی کیونکہ اس کے اپنے حالات ایسے نہ تھے کہ خود بخود وہ عناصر اور مرکبات بن جاتے جن سے زندگی بنانا مقصود تھی۔ ان مرکبات میں سے سب سے اہم پانی تھا جو اس وقت نہ تو زمین پر موجود تھا اور نہ ہی یہاں بن سکتا تھا۔ چنانچہ پانی کا اکثر حصہ آسمان سے ہی آیا اور اپنے ساتھ زندگی بنانے کے ''بیج'' بھی لایا تا اُن سے زندگی بنے اور زمین خوبصورت اور پر رونق ہو جائے۔ پھر جب اس زمین کو وہ حُسن دے دیا گیا تو پھر اس باشعور وجود کو بنایا گیا جو انسان تھا یعنی Homo sapiens تا کہ وہ اس خوبصورت تخلیق کو دیکھے، اس پر غور کرے اور سوچے سمجھے اور جس نے اس کرۂ ارض کو اور خود انسان کو بنایا ہے وہ اُس خالق کی پہچان کرے اور اس کی تعریف کرے کیونکہ یہی اس ذہین وجود کی زندگی کا مقصد ہے۔

کرۂ ارض پر زندگی بنانے کے لئے حالات:

آج سے 4.5 بلین سال قبل زمین نظام شمسی کے ایک Planet کے طور پر وجود میں آئی۔ اس وقت یہ ایک گرم لاوے کا گولہ تھا جو سورج کے گرد گھوم رہا تھا۔ اس کے اوپر کے حصے کو ٹھنڈا ہونے میں 700 ملین سال لگے لیکن اس سے قبل ہی ایک بہت اہم واقعہ زمین کے ساتھ پیش آ گیا، جب مریخ کے سائز کا ایک planet (جس کا نام سائنس دان Theia رکھتے ہیں) زمین کے ساتھ ٹکرا گیا جس سے چٹانوں اور مٹی کا ایک بادل اُٹھا اور زمین کو دھکا لگنے کے نتیجہ میں زمین اپنے axis پر 23.5^{o} ٹیڑھی یعنی tilt ہو گئی اور اپنے محور پر گھومنے لگی (یعنی started spinning around itself)۔ یہ واقعہ معمولی نہ تھا بلکہ زمین کے لئے اس کی کلیدی اہمیت تھی۔ چنانچہ یہ tilt اور زمین کا گھومنا مستقبل میں بہت اہم ثابت ہوا۔ زمین پر مختلف موسم اور تبدیلیاں دن رات کا آگے پیچھے آنا اسی ایک حادثہ سے وجود میں آئے۔ مٹی اور پتھروں کے بادل کا کچھ حِصّہ زمین کے گرد گھومنے لگا اور پھر اس نے چاند کی شکل اختیار کر لی۔ سائنس دان کہتے ہیں آج کی نسبت چاند ماضی میں زمین کے قریب تھا یعنی صرف 22 ہزار کلومیٹر کے فاصلہ پر جبکہ آج یہ فاصلہ 40 ہزار کلومیٹر ہو چکا ہے۔ چاند کا بھی زمین کے ساتھ بہت اہم تعلق ہے۔ یہ زمین کے ساتھ ساتھ گھومتا اور زمین کی gravity کو stable رکھتا ہے اس کے علاوہ زمین کی rotation کو درست اور harmonious یعنی ایک ہی رفتار پر برقرار رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زمین پر زندگی کے آغاز کے حوالہ سے چاند کا بہت اہم role ہے جس کا ذکر بعد میں متعلقہ جگہ پر ہو گا۔

زمین کو زندگی کے قابل بنانے میں بہت سے اہم اور طویل ادوار آئے اور کئی عوامل کام کرتے رہے۔ خالقِ کائنات نے زمین کی درستگی اور اُس کو ٹھیک ٹھاک کرنے کی stages کا ذکر قرآن مجید میں کیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۱۰﴾ وَ جَعَلَ فِيْهَا
رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۱۱﴾ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ
دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ
كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔(حم السجدہ: 10 تا 13)

ترجمہ: تو کہہ دے کیا تم اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو زمانوں میں پیدا کیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو؟ یہ وہی ہے تمام جہانوں کا ربّ۔ اور اُس نے اس کے مرتفع خطوں میں پہاڑ بنائے اور ان میں اُس نے برکت رکھ دی اور اُن میں اُنہی سے پیدا ہونے والے خورد و نوش کے سامان چار زمانوں میں مقدر کئے اس حال میں کہ (سب حاجتیں) طلب کرنے والوں کے لئے وہ برابر ہیں۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں دھواں تھا اور اُس نے اس

سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے یا مجبوراً چلے آؤ۔ اُن دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پس اُس نے ان کو دو زمانوں میں سات آسمانوں کی صورت میں تقسیم کر دیا اور ہر آسمان کے قوانین اس میں وحی کئے اور ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں اور حفاظت کے سامانوں کے ساتھ مزیّن کیا۔ یہ کامل غلبہ والے (اور) صاحبِ علم کی تقدیر ہے۔

NASA سے منسلک سائنس دان بتاتے ہیں کہ زمین ہمارے نظامِ شمسی میں بالکل صحیح جگہ پر ہے مگر اس کے حالات شروع میں ایسے نہ تھے کہ اس پر زندگی بن سکتی۔ ہماری زمین کئی ادوار میں زندگی کے لئے درست ہوئی۔ زمین کے مسلسل گھومنے کی وجہ سے اس کے اندر موجود Iron اور Nickle نے ایک magnetic field پیدا کر لی جس نے زمین کو گھیر لیا اور اس سے سورج کی خطرناک شعاعوں اور solar winds سے زمین کا بچاؤ ہوا۔ آج بھی ہم اس حفاظت کا ایک خوبصورت نظارہ Auroras کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

چاند نے زمین کی evolution اور بہتری کے لئے بہت سے کام کئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ربّ العالمین ہے اسکو شروع سے ہی ہماری خدمت میں لگا دیا تھا۔ اسکی زمین سے پَرے والی طرف پر meteorite ٹکراتے ہیں اور اس طرح یہ زمین کے لئے ایک ڈھال کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ عمل زمین بننے کے 40 ملین سال بعد شروع ہوا، کرۂ ارض جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، گرم ابلتے لاوے کا ایک گولہ تھا، زمین کی گردش(spinning) کی وجہ سے اس کے ٹھنڈا ہونے کا عمل مکمل ہوا۔ زمین کو زندگی کے قابل بنانے کا ہر لمحہ خدائی حکمت کا ایک شاہکار نظر آتا ہے گویا it was a Divinely controlled process جس طرح کائنات کے بننے کا ہر step بہت درست اور Finely Tuned تھا اسی طرح زمین کے اوپر زندگی بنانے کے لئے حالات کو سازگار بنانا بھی کوئی حادثاتی واقعہ نہ تھا۔ سب کچھ بہت precision اور صحیح طریق سے ہوا اور زمین کے وجود میں آنے سے پہلے ہی کائنات میں ہونے والے reactions، پانی کا بننا اور دیگر Chemicals کا بننا گویا وہ ”زندگی کے بیج“ (seeds) تھے جو اب تیار ہو چکے تھے۔ اب زمین ہموار اور درست ہو رہی تھی اصول اور قوانین مرتب ہو رہے تھے۔ یہ سب تیاری زندگی کی پیدائش کے لئے درست سمت میں جا رہی تھی اور ان میں سے کچھ بھی خود بخود یا Coincidence نہ تھا بلکہ تمام factors زندگی بنانے کے لئے کام کر رہے تھے جن کے نتیجہ میں بالآخر زمین زندگی کے لئے ایک perfect place بن گئی تا کہ زندگی evolve ہونے کا process شروع ہو سکے۔

قرآن مجید میں تخلیقِ زندگی کی stages مختلف سورتوں (Chapters) میں بیان ہوئی ہیں جب ہم اُن حقائق کو اکٹھا کرتے اور ترتیب سے جوڑتے ہیں اور پھر سائنس دانوں کی تحقیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ قرآن حکیم اور سائنس میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے نیز ہر جگہ خدا تعالیٰ کا مخفی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے۔ جانداروں کی

لاکھوں اقسام (Animal and plant species) اتنی خوبصورتی اور تناسب سے بنی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھ کو اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ان کا ایک ایسا خالق ہے جو حُسن و احسان میں بے نظیر اور بہترین مصوّر ہے۔ زندگی کی تخلیق کے لئے یہ سب کچھ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا تھا اور انسان کا ذہن حیران ہوتا ہے کہ کس طرح خالق نے "مردہ" (non living) یعنی Chemicals سے "زندہ" (living) کو بنادیا اور کیسے یہ زندگی سب سے پہلے ایک بہت چھوٹے (ایک ملی میٹر سے سو گنا چھوٹا) 0.01 ملی میٹر سائز کے cell کی شکل میں وجود میں آئی۔ اس عظیم الشان معجزے کا سفر حقیقت میں ایک دلچسپ اور حیرت انگیز داستان ہے اور اس کا بننا کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ جس طرح کائنات خود بخود بننے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں اسی طرح اس زمین پر اتفاقیہ طور پر زندگی بننے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ جس طرح کائنات میں ستارے، اجرام فلکی اور کہکشاؤں کے بننے کے لئے بہت منظم اور مربوط قوانین اور حسابات تھے اسی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کرۂ ارضی پر زندگی بننے کے لئے، یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے cell کے بننے کے لئے بھی، انتہائی باریک حسابات اور منظم اور مربوط قوانین تھے۔ کچھ بھی by chance یا ایسے ہی حادثاتی طور پر Coincidence سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو ایک اتفاق مانا جائے تو یہ ایسا ہی ہو گا جیسے Michael J. Murray جو امریکی فلاسفر اور Pennsylvania کے Franklin & Marshal college میں پروفیسر ہیں، اُن کی کتاب Reason for the Hope Within میں ایک مثال درج ہے کہ آپ کائنات کے دوسرے کنارے سے یعنی 20 ارب نوری سال کے فاصلے سے ایک گولی چلائیں اور ایک انچ کا ٹارگٹ ہو اور گولی وہیں جا لگے۔

یہ تو سبھی مشہور سائنس دان کہتے ہیں کہ تخلیق کائنات میں ہر step کے لئے بہت Fine Tuning تھی اور اسی Precision اور accuracy کی وجہ سے ایسا خوبصورت design وجود میں آیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زمین پر قرار پکڑنے والی ہر قسم کی زندہ چیزوں میں بہت ہی خوبصورت تناسب، درستگی اور صلاحیتوں کا تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آسمان پر اور کائنات کے طول و عرض میں ایک تناسب اور تنوع ہے۔ اس حقیقت کی عکاسی Catholic University کے Religion اور Philosophy of Sciences کے پروفیسر Michael Hanby نے اپنی کتاب میں کی ہے جس کا نام:

No God No Science: Theology, Cosmology, Biology 2013

ہم جانتے ہیں کہ کائنات بننے کا عمل ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ تھا اسی طرح زمین پر بھی life ارتقا کی مختلف stages سے گزری اور 4 بلین سال سے زائد عرصہ میں یہ عمل مکمل ہوا۔ ارتقا ایک Cell یعنی life کی اکائی بننے کا ہو یا

highly evolved انسان کا سب کو مختلف stages سے گزرنا پڑا۔ یہ stages سائنس دان تو آج دریافت کرتے ہیں مگر خالق حقیقی نے بہت پہلے ان کے بارہ میں بتا دیا تھا جس کو ہم اُسکی revealed Book قرآن کریم میں پاتے ہیں اور رب قدیر نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ سب کچھ اُس نے بڑی ترتیب اور درست تناسب سے بنایا ہے اور ارتقا سے درجہ بدرجہ ترقی دی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۞ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔(نوح: 14 تا 16)

ترجمہ: تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے وقار کی توقع نہیں رکھتے حالانکہ اُس نے تم کو مختلف اطوار سے پیدا کیا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو طبقہ بر طبقہ پیدا کیا۔

ان تمام آیات کے خوبصورت الفاظ ''وَقَارًا'' ''اَطْوَارًا'' اور ''طِبَاقًا'' درجہ بدرجہ ترقی، بتدریج بلندی اور مختلف stages کو ہی بیان کر رہے ہیں ۔ یہ تمام چیزیں تخلیق کائنات میں بھی نظر آتی ہیں اور زمین پر life کے بننے میں بھی ہمیں یہی process نظر آتا ہے۔

چنانچہ زمین پر cell بننے کی stages کو بھی قرآن مجید نے بیان کیا ہے، اسی طرح انسان کے ارتقا کے مدارج کا بھی ذکر ہے اور انسان کی development کی stages جو ماں کے uterus میں ہوتی ہیں ان کا بھی ذکر ہے تا کہ دونوں ارتقاؤں میں مطابقت نظر آئے اور یہ بھی واضح ہو کہ مدارجِ تخلیق میں ہر چیز اور ہر chemical اپنی اپنی جگہ صحیح فِٹ کیا گیا۔ یہ سب کچھ نہ تو by chance ہوتا ہے، نہ کوئی coincidence ہے اور نہ ہی blind selection ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس خدا کو خالق کے طور پر آئن سٹائن۔ نیوٹن۔ عبد السلام اور بہت سے اور سائنس دان کائنات کی خوبصورتی اور harmony میں ثابت کرتے تھے وہی Biology کا بھی خدا ہے اور اُسی کا وجود اس زمین کی Biology میں بھی ثابت ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سائنس اور قرآن میں کوئی تضاد نہیں۔ زندگی بننے کا یہ ارتقا اور مدارج اور انسان کی ارتقا کی stages قرآن نے اُس وقت بتا دیں جب اس سائنس اور Darwinian evolution کا وجود بھی نہ تھا اور قرآن نے ہی بتایا کہ جب انسان ارتقا کی بلندی پر پہنچا تو باشعور کہلایا یعنی Homo sapiens۔

زمین پر زندگی کی ابتدا کے لئے شروع میں حالات ساز گار نہ تھے بہت سے آتش فشاں پھٹتے رہتے تھے۔ لاوا ابلتا رہتا تھا، بجلیاں چمکتی تھیں۔ سورج سے خطرناک radiations اور UV آ رہی تھیں۔ کالا اندھیرا تھا۔ غرض یہ سب بہت خوفناک تھا اور زمین پر جو حالات تھے اُن میں زندگی بنانے کے لئے نہ تو ingredients تھے اور نہ ہی زندگی کا سب سے اہم جزو یعنی پانی۔ لیکن اُس وقت آسمان سے Meteors کی بارش ہو رہی تھی اور یہ عمل ایک بلین سال تک جاری رہا۔ زمین

ٹھنڈی ہو گئی۔ اوپر کی سطح پر پانی اکٹھا ہو گیا اور وہ chemicals بھی میسر ہو گئے جن سے زندگی یعنی cell بننے کا آغاز ہونا تھا۔ اس پورے عمل کا سب سے اہم جزو سمندروں کا بننا تھا جس میں پھر آئندہ زندگی کی کیمسٹری کے آغاز کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔

سائنس دان آج تسلیم کرتے ہیں کہ زمین پر زندگی شروع کرنے کے لئے بہت باریک تناسب اور حکمت سے بہت سے عوامل کام کر رہے تھے اور یہ سب کچھ صرف اسی سیارہ سے مخصوص تھا۔ meteorites (شہابیوں) کے ذریعے جو پانی اوپر سے آ رہا تھا اُس کا کام صرف زمین کو ٹھنڈا کرنا نہیں تھا بلکہ حالات کو زندگی کے آغاز کے لئے تیار کرنا بھی تھا۔

Meteorites پر تحقیق سے قبل سائنس دان یہی سمجھتے تھے کہ زمین پر زندگی بننے کے لئے سب سے پہلے chemical evolution ہوئی اور چھوٹے organic molecules بننے شروع ہوئے جن میں کاربن کے ایٹمز کے ساتھ آکسیجن (O_2) اور ہائیڈروجن (H) مختلف طریقوں سے جڑتی رہی۔ لیکن انہیں اس حقیقت کا ادراک نہ ہو سکا یا انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ زمین کے ابتدائی دور میں تو اس کرہ پر اتنی فری آکسیجن ہی نہیں تھی کہ اتنی کثرت سے Organic compounds بن سکتے، فری آکسیجن تو simple life کے بننے کے بعد photosynthesis کے ذریعہ سے زمین پر میسر آئی۔

organic compounds کیا ہیں؟ یہ کمپاؤنڈز دراصل ہر ایک cell اور پھر تمام جانداروں کے building blocks ہیں جیسا کہ proteins بننے کے لئے aminoacids درکار ہوتے ہیں جو کہ Organic Compound ہیں اور DNA، RNA کے لئے nucleotides اور sugars۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی کی بنیاد ہیں اور جن سے مل کر زندگی بنتی ہے اور اس کا نظام چلتا ہے۔ ابتدائی طور پر سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ ضروری اجزاء زمین پر خود بخود (spontaneously) سادہ مالیکیولز سے بن گئے ہوں گے۔ چنانچہ 1920 میں دو سائنس دانوں نے یہ موقف پیش کیا۔ ان میں سے ایک روسی سائنسدان Alexander Oparin تھا اور دوسرا برطانوی سائنسدان J.B.S Haldane ایک کیمسٹری کا ماہر تھا اور دوسرا یعنی Haldane، جینیات کا ماہر تھا۔

30 سال گزرنے کے بعد Oparin اور Haldane کے نظریے کو تقویت دینے کے لئے 1952ء میں دو امریکی سائنس دانوں Stanley Miller اور Harold Urey نے شکاگو یونیورسٹی میں ریسرچ کے دوران ایک ایسا apparatus بنایا جس میں وہ simple chemicals ڈالے گئے جو اُن کے خیال میں زمین کے آغاز میں اس پر تھے اور وہ حالات بھی مہیا کئے گئے جو اُس وقت ہوں گے مثلاً بجلی کے sparks گرمی اور UV وغیرہ۔

اس کے علاوہ methane (CH_4) Ammonia (NH_3) Hydrogen (H_2) اور پانی (H_2O)۔ یہ تجربہ کئی دن تک جاری رہا اور کئی قسم کے amino acids بھی بنے۔ اس apparatus میں وہ chemicals بھی ڈالے گئے جو آتش فشاں پہاڑوں سے نکلتے تھے جیسا کہ کاربن ڈائی اوکسائیڈ (CO_2) اور کاربن مونو اوکسائیڈ (CO) Urey اور Miller کے تجربات سے یہی نتیجہ نکلا کہ زمین کی ابتداء میں یعنی 4.0 بلین سال قبل جو حالات تھے اُنہی سے وہ Chemicals بنے جو زندگی یعنی cells بنانے کے لئے ضروری تھے اور یہ سب chemicals ان حالات کے نتیجہ میں spontaneously بن گئے۔

لیکن اس تجربہ ایک چیز فروگزاشت ہو گئی اور وہ یہ کہ سائنس دان اپنی مرضی اور ضرورت کے تحت تجربات میں حالات اور chemicals کو داخل کرتے رہتے تھے جیسے oxygen جو کہ شروع کی زمین میں وافر مہیا نہ تھی۔ سب سے اہم بات جو بعد میں سائنس دانوں نے بتائی وہ یہ کہ ابتدائی زمین پر نہ تو methane (NH_4) تھی اور نہ ہی Ammonia (NH_3)۔

روسی سائنس دان Oparin کا یہ بھی خیال تھا کہ جو Organic molecule بنے وہ کم گہرے (shallow) سمندروں میں اکٹھے ہو گئے ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں ایک "Organic soup" بن گیا ہو گا۔ پھر چھوٹے organic molecules خود بخود مل کر بڑے molecules بن گئے ہوں گے۔ یعنی سائنس کی اصطلاح میں monomers سے polymers وجود میں آئے ہوں گے۔ لیکن بعد میں سائنس دانوں نے اس کو بھی غلط ثابت کر دیا کہ یہ عمل یعنی monomers جیسے کہ amino acids کا مل کر بڑے molecules (polymers) جیسے کہ proteins کا بننا اتنا آسان نہیں ہے اور نہ ہی یہ عمل خود بخود کم گہرے سمندروں میں ہو سکتا ہے۔ یہ عمل (polymerization) جس میں دو amino acids جڑتے ہیں یعنی Condensation کا عمل ہوتا ہے یہ خود بخود نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے enzymes درکار ہیں جو اپنی nature میں خود پروٹین ہوتے ہیں۔ کئی معروف Biologists نے اس امر کا اظہار کیا ہے جن میں سے ایک Harvard University کے ایک بہت معروف پروفیسر Claude Villee ہیں جنہوں نے اپنی کتاب Biology میں صفحہ 41 پر بھی لکھا ہے کہ polymers بننے کے لئے بہت سارے اور عوامل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ممکن نہیں کہ خود بخود ایسے ہی یہ polymers بن جائیں۔

چنانچہ اب جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہے کہ مذکورہ بالا عمل کے لئے کچھ اور ہی جگہ اور حالات درکار ہوتے ہیں اور یہ process اتنا بھی آسان نہیں ہوتا بلکہ بہت سی stages اور conditions کی ضرورت ہوتی ہے نیز بعض

پروٹینزاور بعض دوسرے ایسے مرکبات تھے جن کا DNA بننے سے قبل موجود ہونا ضروری تھا۔ اور ان مرکبات کے بارہ میں غالب امکان یہی ہے کہ یہ اس وقت زمین پر موجود نہیں تھے اور نہ بن سکتے تھے کیونکہ اُن کے لئے زمین پر مناسب حالات موجود نہ تھے۔ تو اس صورتحال میں ہم وضاحت سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرکبات اور پروٹینز لازمی طور پر زمین سے باہر کسی جگہ بنے ہوں گے۔

بہت لمبے عرصہ تک سائنس دان اس طرف متوجہ ہی نہ ہوئے کہ ابتدائی زمین پر کروڑوں سال تک جو شہابیوں (meteorites) کی بمباری ہوتی رہی ہے اُس کی زندگی کے وجود میں کیا اہمیت تھی اور پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ meteors کی بارش وقت گزرنے پر رک بھی گئی اور وہ ماحول پیدا ہو گیا جو زندگی کے آغاز کی اگلی stage یعنی (cells) بننے کی شروعات کے لئے ضرور تھا۔ اس پہیلی کو سلجھانے کے لئے شہابیوں پر تحقیق ضروری تھی۔ زمین پر بسنے والے انسان شروع سے meteors کا نظارہ کرتے چلے آئے تھے۔ ماہرین فلکیات (astronomers) نے بتایا کہ شہابیے دراصل وہ "مٹی" (star dust) ہے جو Comets اور asteroids سے آتی ہے اور بہت تیزی سے زمین کی فضا(atmosphere) میں داخل ہوتی اور زمین پر گرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات ان کا حجم ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرات کی طرح ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ بڑے سائز کے بھی ہوتے ہیں۔ جب یہ زمین پر گرتے ہیں تو ان کو meteorite یا شہابیے کہا جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم انہی meteorites کے بارے میں بات کریں گے جن کی اہمیت اُن کے اندر موجود اُن Chemicals کی وجہ سے ہے جن سے ابتدائی cell بنا ہو گا۔ پھر ان شہابیوں میں ایک اور اہم چیز اُن میں موجود پانی بھی تھا جو زندگی کے آغاز کے لئے سب سے ضروری عنصر تھا اور پھر ان میں وہ کاربن سے جڑ کر بنے ہوئے مختلف amino acids تھے جنہوں نے زمین پر مختلف اقسام کی پروٹین بنائی۔ نیز وہ sugars اور نائٹروجن والی bases جن سے اہم ترین DNA اور RNA کا بننا مقصود تھا جس سے پھر cell ایک جاندار کے طور پر کام کرنے لگا۔

زندگی کے لئے پانی کی اہمیت:

کیا آپ نے پانی پیتے ہوئے کبھی سوچا ہے کہ خالقِ کائنات کے عظیم کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے یہ اتنی بڑی نعمت ہماری زمین کے لئے Life بننے سے قبل ہی کائنات میں بنا کر دی وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔(الانعام: 100) وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔(المومنون: 19)

کرۂ ارض کو سائنس دان water planet کہتے ہیں کیونکہ اس کا زیادہ تر حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ سمندروں کی گہرائی کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکی مقدار بہت زیادہ ہے۔ زمین پر موجود بہت سے جاندار پانی کے اندر ہی رہتے

ہیں کیونکہ پانی اُن کی بقا کے لئے بہترین medium ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکی ساخت دو ہائیڈروجن اور ایک آکسیجن ایٹم سے مل کر ایک ایسا structure بناتی ہے جو بہت Unique ہے۔ اسی لئے اسکی physical and chemical خاصیتیں بہت اہم ہیں۔

اوّل اوّل زمین پر زندگی کا بننا، زندہ رہنا اور اس کا ارتقا پانی کا ہی مرہونِ منت رہا تھا۔ اسی لئے جب زندگی کی پہلی اکائی (cell) بنی تو اس پانی کے ایک tiny قطرہ میں وہ تمام Chemicals ڈال دیئے گئے جو زندگی قائم رکھنے کے لئے ضروری تھے اور اس tiny drop کو lipid اور proteins کی covering نے محفوظ کر دیا جو آج بھی ہر cell کی membrane کہلاتی ہے۔

ہر جاندار کے Cell کا 70 فی صد حصہ پانی پر مشتمل ہے، اس طرح انسانی جسم جو ان خلیات کا مجموعہ ہے اس کے وزن کا بھی 70 فی صد حصہ پانی ہی ہے اور جسم میں جو بھی process ہو رہے ہیں اُن کے لئے پانی درکار ہے اس لئے ہم ہمیشہ پانی پیتے ہیں تا کہ تمام Chemical reactions آسانی سے ہوتے رہیں۔ ہمارے گردے کام کریں، ہمارا دماغ درست رہے اور ہمارے جسم کا درجۂ حرارت بھی Constant رہے۔ یہ پانی کی properties ہی ہیں جن کی وجہ سے سردی اور گرمی کے موسم میں سمندروں جھیلوں اور دریاؤں کا درجۂ حرارت ایک دم سے بڑھتا یا کم نہیں ہوتا اور اُس کے اندر رہنے والی زندگی آرام سے survive کرتی رہتی ہے۔ پانی کی بہت زیادہ مقدار کی یہی اہمیت ہے کہ اس نے زمین کو بہت گرم اور بہت سرد ہونے سے بچا رکھا ہے اور اسی وجہ سے جانداروں کا درجۂ حرارت بھی ایک جیسا رہتا ہے کیونکہ اُن کے ہر cell میں 70 فی صد پانی ہے۔

جب زمین بنی تو اس پر پانی نہ تھا۔ پانی اوپر کائنات میں بن کر ہماری زمین پر آیا اور وہ meteorites جو زندگی بنانے کے ingredients لا رہے تھے وہ پانی بھی لے کر آئے۔ کروڑوں سال کے اس عمل سے زمین کا زیادہ حصہ پانی سے ڈھک گیا جس سے نہ صرف وہ Chemicals محفوظ رہے جنہوں نے زندگی کا آغاز کرنا تھا بلکہ آغاز حیات کے لئے اولین chemical reactions بھی اسی پانی میں ہو سکے اور ان کیمیائی عملوں کے نتیجہ میں جب cell بننے تھے تو اسی liquid میں وہ Chemicals ایک خاص مقدار میں اکٹھے ہو گئے اور cell کا structure بن گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے اور باریک عمل میں کچھ بھی گڑبڑ (haphazard) نہ ہوا۔ چنانچہ جو بھی Unicellular زندگی بنی وہ تمام کی تمام پانی میں ہی رہی اور اُسی میں اس کا ارتقا ہوتا رہا۔ یک خلیوی جانداروں (unicellular organisms) سے multicellular زندگی کی variety اور diversity بننے میں قریباً 3.5 بلین سال لگے لیکن اس ارتقاء اور ترقی اور

تنوع کے باوجود آج بھی وہ Unicellular زندگی یہاں تک کے سب سے simple organisms بھی موجود ہیں۔

پس زندگی کے لئے اور زندگی بنانے کے لئے پانی بہت اہم تھا اور اس کا ہونا بہت ضروری تھا تبھی اللہ تعالیٰ نے Big Bang کے ہونے کے بعد نہ صرف ستارے بنائے بلکہ پانی بھی تبھی بنادیا تھا اور اسی کا ذکر سورۃ الانبیاء میں ہے:

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔(الانبیاء: 31)

ترجمہ: کیا انہوں نے دیکھا نہیں جنہوں نے کفر کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے۔ پھر ہم نے ان کو پھاڑ کر الگ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی تو کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے ؟

عقل و دانش حیران ہو جاتی ہے اس بیان پر کیونکہ ابتدائی پانی زمین پر نہیں بن سکتا تھا کیوں کہ یہاں نہ وہ energy تھی نہ وہ حالات جن سے پانی بنتا۔ اگر وہ valcano کے پھٹنے سے بنتا بھی تو بھی اس نے اوپر ہی بننا تھا کیونکہ آکسیجن، ہائیڈروجن اوپر ہی بنی تھی۔

Meteorites کی اہمیت:

آسٹریا کے شہر Vienna کے Natural History Museum میں ایک شہابیہ یعنی meteorite رکھا گیا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 7 نومبر 1492ء کو آسمان سے ہوا کے ایک طوفان (thunderstorm) کے وقت گرا تھا۔ اسی لئے اس شہابیے کا نام thunderstone رکھا گیا ہے۔ اسی طرح 1807ء میں امریکہ میں گرنے والا meteorite فضا میں پھٹنے کے بعد گرا اور اس کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں meteorites گرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ان شہب سے بہت سی تباہیاں بھی ہو جاتی ہیں مثلاً 1908 میں 30 میٹر قطر (diameter) کا ایک asteroid روس کے ایک شہر کے اوپر فضا میں پھٹا اسے اس کے مقام کی مناسبت سے Tanguska Event کہا جاتا ہے۔ اس دھماکے سے لگ بھگ 80 ملین درخت جل گئے اور بہت سے درخت جڑ سے اکھڑ گئے یہ دھماکہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم سے ایک ہزار گنا زیادہ سخت تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سائبیریا کے علاقے میں گرا جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔

زمین کی تاریخ میں غالباً سب سے اہم meteorite تو وہی تھا جو سائنس دانوں کے ایک نظریہ کے مطابق مریخ کے سائز کا تھا اور جس کا نام Theia تھا جس کے زمین پر گرنے کے نتیجہ میں چاند بنا۔ ایک اور تباہ کن meteorite آج سے تقریباً 65 ملین سال قبل گرا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اسکا سائز 10 سے 15 کلومیٹر تھا۔ اس شہابیے کے گرنے سے بہت بڑی تباہی آئی اور زمین پر موجود تمام Dinosaurs ختم ہو گئے اور باقی حیات کا بھی 70 فیصد حصہ ختم ہو گیا۔

سائنسی اعتبار سے وہ شہابیے بہت اہم ہیں جن میں سائنس دانوں نے بہت دلچسپی لی ہے کیونکہ ان پر مزید تحقیق کرنے سے ہمیں کائنات میں ہونے والی evolution کا علم ہوتا ہے دوسرے planets پر زندگی بننے کے خام مادے (raw materials) بھی ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ان کی کیمسٹری میں لوہا اور Nickell ہے جیسے کہ وہ meteorite جو 3 اپریل 1984ء کو نائیجریا میں گرا۔ اسی طرح وہ سب سے بڑا 66 ٹن (54000 کلو گرام) وزنی Hoba meteorite جو Namibia میں 1920ء میں پڑا ملا وہ نہ جانے کتنے ہزار سال پہلے گرا۔ اس میں بھی لوہا اور Nickel ہی ہے لیکن وہ meteorites جو Carbonaceous ہیں وہ زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان میں کاربن والے مرکبات ہیں یعنی organic compounds جو زندگی بنانے کے لئے بہت ضروری تھے۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی ابتدا کے لئے پانی اور دوسرے ingredients زمین کے باہر کائنات سے بن کر آئے تھے۔

Meteorite Murchison کے اندر چھپے راز:

زمین پر بے شمار asteroids ٹکڑے گرتے ہیں مگر سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب تب آیا جب ایک ایسا بہت بڑا ٹکڑا جو اپنے اندر چھپے راز لے کر زمین پر بے شمار pieces میں بکھر گیا اور Murchison کہلایا۔ اُس نے انسانیت کی توجہ اِس حقیقت کی طرف مبذول کروائی جس کا ذکر قرآن کریم میں 1400 سال پہلے کیا گیا تھا اور وہ حقیقت یہ ہے کہ:

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمۡ اَزۡوَاجًا۔(الفاطر: 12)

ترجمہ: اور اللہ ہی ہے جس نے تمہیں "مٹی" سے پیدا کیا پھر "نُّطۡفَۃٍ" (Cell) سے پھر تمہارے جوڑے بنائے۔

اس آیت میں جس مٹی (تراب) کا ذکر ہے وہ یہی meteors اور meteorites ہیں جو آج بھی زمین پر گرتے ہیں اور ہمیں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ زمین کے بننے کے کچھ لاکھ سال بعد ہی زمین پر اس مٹی کی بارش شروع ہو گئی تھی اور پھر یہ بارش کروڑوں سال تک جاری رہی۔ اس بارش کے ذریعہ زمین پر وہ Chemicals آ رہے تھے جو زندگی بنانے کے لئے اہم اور ضروری جزو تھے اور یہ chemicals زمین کی پیدائش سے بھی پہلے کائنات اور نظام شمسی (solar system) میں بن رہے تھے۔

1969ء میں آسٹریلیا کے ایک قصبہ Murchison میں ایک meteorite گرا۔ یہ شہابیہ آسمان میں ہی پھٹ گیا اور اس کے ٹکڑے 35 کلو میٹر کے بے آباد علاقے پر گرے۔ یہ کالے رنگ کے ٹکڑے جن کا وزن کم از کم 100 کلو گرام تک ہو گا ان میں سے 80 کلو گرام تک ٹکڑے جمع کر لئے گئے تا کہ میوزم میں رکھے جا سکیں اور دنیا کے سائنس دان اور NASA کے لوگ انہیں تحقیق کے لئے استعمال کر سکیں۔ Melbourne کے میوزم میں اس کے بہت سے

ٹکڑے موجود ہیں اسی شہر کی یونیورسٹی کے ڈاکٹر John Lovering نے بتایا کہ انہوں نے ہی اسکے ٹکڑے 1969ء میں اکٹھے کرنے کا انتظام کیا تھا تا کہ اس کی authenticity قائم رہے۔

یہ وہ اہم meteorite ہے جس سے ماہرین کو بہت دلچسپی ہے اور اس پر سب سے زیادہ ریسرچ کی گئی ہے اور ابھی تک اس پر کام جاری ہے اور اس حوالہ سے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس meteorite نے یہ راز کھولا کہ اس زمین پر زندگی بنانے کے لئے جو سب سے اہم ingredients یعنی amino acids درکار تھے وہ کائنات میں ہی بنے اور پھر زمین پر آئے۔ چنانچہ اس شہابیے میں 70 سے زائد amino acido ملے ہیں جب کہ زمین پر جو بھی زندگی ہے اُس میں صرف 19 amino acids استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس شہابیے میں اور بھی بے شمار ایسے chemicals ہیں جن کا زندگی کے ارتقا اور بقا میں کلیدی کردار تھا۔

اس شہابیے کے مطالعہ سے ہمیں یہ راز بھی معلوم ہوا کہ نظام شمسی بننے سے قبل Supernova میں اور بھی elements بن رہے تھے جیسے nano diamond اور silicon carbide کیونکہ یہ meteorite دراصل 7 بلین سال پرانا ہے جبکہ نظام شمسی کی پیدائش لگ بھگ ساڑھے 4 بلین سال قبل ہوئی تھی۔ NASA کے مطابق یہ سب سے پرانی star dust ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کائنات میں جس قسم کے بے شمار Chemicals بن رہے تھے وہ دوسرے planets پر transport بھی ہوتے تھے لیکن زندگی جس زمین پر بنانی مقصود تھی اس کے اوپر گرنے والے کیمیکلز اُسی کے مطابق اتارے گئے جس کے نتیجہ میں وہ building blocks مہیا ہوئے جن کا حتمی نتیجہ انسان کی پیدائش کی صورت میں نکلا۔ اس طرح Murchison meteorite نے نہ صرف Cosmology کے بارے میں بلکہ کائنات میں زندگی کے آغاز اور ارتقاء کے حوالہ سے بھی بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں یعنی یہ کہ organic molecules کائنات کے intersteller medium میں بنتے ہیں اور ظاہر ہے اس میں کاربن (C) کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ کاربن نہ صرف organic compounds بناتا ہے بلکہ hydrocarbons بھی جیسے Ammonia، hydrogen cyanide، methanol،formaldehyde وغیرہ۔ یہ Componds بھی اس Murchison شہابیے میں موجود ہیں۔

- سب سے اہم دریافت اس meteorite میں 12 فی صد پانی کی موجودگی ہے۔ جی ہاں وہی پانی جس نے زمین پر زندگی کے آغاز کو ممکن بنایا اور کیمیائی عمل کے لئے مناسب medium مہیا کیا۔
- Murchison meteorite کے پچاس سال کے بعد Melbourne کے میوزیم میں لیکچر کے

دوران وہاں کے Deputy Director, Sciences جناب Henry Dermont نے بتایا کہ یہ meteorite بہت غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں Cosmology سے متعلق بہت سی اہم معلومات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے اور meteorites بھی کائنات میں بنے ہوئے ہیں جو organic Compounds اور پانی زمین پر لاتے رہے ہیں۔

- اسی شہابیے پر ایک اور سائنٹفک ریسرچ گزشتہ دہائی میں کی گئی جس کی رپورٹ 4 اپریل 2017ء کو Nature میں شائع ہوئی۔ اس ریسرچ رپورٹ میں یہ انکشاف کیا گیا کہ اسی شہابیے کے ٹکڑوں سے دس نئے amino acids ملے ہیں اور اس طرح اب تک ملنے والے amino acids کی تعداد 86 ہو گئی ہے۔
- اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ amino acids کائنات میں موجود مختلف asteroid میں Strecker reaction سے بنے ہوں گے جس میں Cyanide اور Ammonia کے ساتھ aldehyde یا ketone کا reaction ہوتا ہے۔ چنانچہ Strecker Reaction کے یہ سارے اجزاء بھی meteorite میں موجود ہیں۔ aldehyde اور ketones سے دوسرے organic compounds بھی بنتے ہیں جو زندگی بنانے کے لئے ضروری ہیں۔
- سائنس دان تجربات کر کے یہ بھی معلوم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں کہ اور کون سے کیمیائی عمل کائنات میں ہوئے ہوں گے جس سے یہ building blocks بننا ممکن ہوئے۔
- اس meteorite میں سب سے زیادہ Glycine amino acid ہے جس سے جانداروں میں بہت سی پروٹین کی chemistry بنتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا Alanine amino acid ہے جس کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں L-alanine ہے اور یہ قسم جانداروں کی پروٹین میں عام طور پر موجود ہے۔
- اس کے علاوہ کئی rare قسم کے amino acids بھی اس meteorite میں دریافت ہوئے ہیں۔
- اس شہابیے میں aldehydes کی موجودگی یہ بتا رہی ہے کہ aldehydes (formaldehyde, acetyldehyde) کائنات میں کافی تعداد میں بن رہے تھے اور پھر انہی سے formose reaction کے ذریعہ سے sugars بنی تھیں اور یہ سب کچھ سائنس دانوں کو اسی meteorite سے پتہ چلا۔ (یہی سچائی ہے جو ہم دہریہ لوگوں کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ خالق نے قوانین بنائے اور سائنس دان خالق کی تخلیق سے ہی اُس کا علم حاصل کرتے ہیں اور اسکی مثال Murchison meteorite اور اس کے اندر چھپے ہوئے راز ہیں۔
- NASA کے ایک Astrobiologist جن کا نام Daniel Glavin ہے انہوں نے فروری 2010ء میں رسالہ Scientific American میں لکھا تھا کہ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ کیمسٹری میں chemicals کی بے

شمار اقسام ہیں اور ان میں complexity بھی ہے مگر ان meteorites نے جو راز کھولے ہیں ان سے یہ علم ہوا ہے کہ دراصل یہ تو ہماری سوچ سے بھی زیادہ complex معاملہ ہے۔

- سائنس دان کہتے ہیں کہ Murchison meteorite اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ اس کے بے شمار ٹکڑے (100 کلوگرام کے قریب) بہت جلد اکٹھے کر لئے گئے اس لئے ان میں کوئی contamination نہ ہوئی۔
- Daniel Glavin نے مزید کہا کہ جو amino acids اس meteorite میں ہیں وہی جانداروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہماری Chemistry دراصل solar system میں بنی اور ہم Stardust سے بنے ہیں۔

(دیکھیں اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے اس راز پر سے یہ کہہ کر پردہ اٹھادیا تھا کہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ...)

Galvin نے کہا "یہ بہت دلچسپ بات ہے مگر مجھے خوفزدہ بھی کرتی ہے۔

"It is exciting but it also scares me at the same time" (Scientific American Feb. 15,2010)

- 20 نومبر 2019ء کے Newsweek میں بھی ایک بہت اہم دریافت کا تذکرہ تھا اور وہ یہ کہ ہر cell کی کیمسٹری میں (یہاں تک کہ bacteria میں بھی) Ribose sugar اور deoxyribose پائے جاتے ہیں جن سے RNA اور DNA بنتا ہے۔ Murchison اور دوسرے (NW Africa 801) meteorite میں Ribose sugar پائی گئی ہیں جو RNA کے بننے کے لئے ضروری ہے۔ Murchison میں یہ مقدار بہت زیادہ ہے۔ سائنس دان حیران ہیں کہ اتنا نازک (Delicate) Ribose اس کے اندر کیسے survive کر گیا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر زندگی بننے کے لئے پہلے RNA ہی بنا ہو گا۔ اسی طرح glyceraldehyde کی موجودگی بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ پہلے RNA ہی بنا ہو گا۔
- NASA کی 8 اگست 2011ء کی رپورٹ کے مطابق ہو سکتا ہے کہ RNA بھی کائنات سے بن کر آیا ہو۔ (https://svs.gsfc.nasa.gov/10810)
- Meteorites میں sugars کا ملنا بہت حیرت انگیز واقعہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے آغاز میں meteorites کی بے شمار بارش کوئی حادثاتی واقعہ نہیں تھا بلکہ زمین پر زندگی بنانے کے لئے باقاعدہ کام ہو رہا تھا اور cell بنانے کے لئے اس کے building blocks زمین پر supply ہو رہے تھے۔ Ribose کے علاوہ اور sugars بھی meteorites میں موجود ہیں جیسے xylose اور arabinose۔ لیکن Ribose sugar بہت اہم ہے کیونکہ RNA میں یہی Sugar ہے اور RNA ہی DNA کو بناتا ہے اسکی مثال Virus ہے جس میں RNA ہے اور وہ host

cell کے اندر جا کر DNA بناتا ہے۔

- آج بھی cells میں RNA ایک messenger کی طرح کام کرتا ہے۔ DNA سے پیغام لیتا ہے کہ کون کون سی protein کو cell کے اندر بننا ہے اور وہاں cell کی اُن "factories" (ribosomes) کو یہ پیغام دیتا ہے جو ضرورت کے مطابق اُس cell کے لئے protein بنا دیتی ہیں۔

NASA کے مطابق meteorites میں پہلے ہی زندگی بنانے والے اہم ingredients موجود تھے جیسے کہ nucleotides اور amino acids۔ اب نئی تحقیقات میں Sugar بھی ان شہابیوں میں دریافت ہو چکی ہے جو بلا شبہ ایک بہت اہم development ہے۔

- Tohoku Uni Japan کے 8 سائنس دانوں پر مشتمل ٹیم نے، جو Department of Earth Science سے تعلق رکھتی تھی، Ribose sugar کی موجودگی کو confirm کیا اور NASA نے 18 نومبر 2019 کو اسکی خبر کو اپنی ویب سائٹ پر شائع کیا۔

(https://www.nasa.gov/news-release/first-detection-of-sugars-in-meteorites-gives-clues-to-origin-of-life)

- اس سے قبل John Hopkin Uni کے Dept. of Phy. & Astronomy کے Pavel Machalek نے بھی 17 فروری 2007 کے اپنے ریسرچ آرٹیکل میں کہا تھا کہ meteorites نے ہمیں بہت حیران کرنے والی حقیقت بتائی ہے کہ کائنات بننے کے بعد وہیں پر organic molecules کے بننے کا process کام کر رہا تھا۔

یہ عمل انسان جیسے ذہین جاندار کی تخلیق کے لئے ضروری تھا اور ان شہابیوں کے ذریعہ سے اس تخلیق کے لئے اس زمین پر ارتقا کی تمام ضروری چیزیں مہیّا کی گئیں۔ پس پانی بھی اوپر سے ہی بن کر آیا اور RNA بھی۔ نیز DNA بنانے کے لئے تمام bases (یعنی Cytosine, guanine, adenine اور Uracil) بھی زمین میں اتارے گئے۔

Tagish Lake Meteorite کی اہمیت:

18 جنوری 2000ء کو ایک meteorite کینیڈا کے شہر British Columbia کے اوپر، آسمان پر، قریباً 30 سے 50 کلو میٹر اوپر پھٹا۔ اُس کے 500 سے زائد ٹکڑے جمی ہوئی Tagish Lake پر گرے۔ جلد ہی اس کے 10 کلو گرام سے زائد وزن تک کے ٹکڑے اکٹھے کر لئے گئے۔ یہ پتھر تقریباً کالے (dark gray) رنگ کے ہیں۔ ان آسمانی پتھروں پر NASA اور کینیڈا کی یونیورسٹیوں میں تحقیقات ہوئیں۔ اور معلوم ہوا کہ ان پتھروں میں بہت سے amino acids کے علاوہ پانی اور دوسرے organic اور inorganic کمپاؤنڈز بھی موجود ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان

پتھروں کے اندر جو پانی ہے وہ اس Lake کا نہیں ہے بلکہ وہی پانی ہے جو فضا یعنی کائنات سے بن کر آتا رہا ہے۔

اس پتھر کی سائنس دانوں نے بہت اہمیت بتائی ہے 11 جون 2011ء کے ایک مضمون نے جو Alexndra Blinova اور D.K Herd نے بعنوان

"Origin and evolution of Prebiotic matter as Inferred from Tagish Lake Meteorite"

لکھا۔ اس میں بہت سے انکشافات کئے کہ اس پتھر میں بہت سے hydrocarbons موجود ہیں اور ایسی Clay بھی موجود ہے جو صرف پانی کی موجودگی میں ہی بنتی ہے (قرآن میں بھی یہی لکھا ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِينٍ۔(الانعام: 3)) اس meteorite نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ شروع میں زندگی بنانے کے لئے کیسے حالات اور conditions درکار تھیں۔ سائنس دانوں کے مطابق اس میں Presolar grains بھی ہیں جن سے علم ہوتا ہے کہ یہ شہابیہ بھی نظامِ شمسی سے قبل وجود میں آچکا تھا۔

ان پتھروں اور دوسرے meteorites سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین پر زندگی کی ابتدا کے لئے geochemistry کیسے تبدیل ہو رہی تھی۔ نیز یہ بھی علم ہوا کہ زمین بننے کے بعد situation اور factors ایسے مناسب نہ تھے کہ وہ زندگی کے آغاز کے لئے precursors بنتے۔ اسی لئے یہ بندوبست کائنات میں کیا جارہا تھا اور زمین پر وہ سارا material بھیجا جارہا تھا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ کاربن سے ملکر بہت سے organic compounds بننے کا عمل کائنات میں ہوا۔ ایک اور حالیہ تحقیق جو امریکہ University of California San Diego میں approve کی گئی اور بہت سے سائنس دانوں نے اس میں حصہ لیا (جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: Richard. I. Nicklin, Brian Langelier, Kimberly, Lee F. White) اسے معروف سائنسی تحقیقاتی رسالہ PNAS(Proceedings of the National Academy of Sciences) نے 26 مئی 2020 کو شائع کیا۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا کہ زندگی بننے کیلئے پانی کی صرف pH ہی مناسب نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل تھے جو مناسب حال تھے۔ یہ پتھر بتا رہا ہے کہ amino acids بننے کے لئے جو پانی چاہئے تھا بالکل ویسا ہی پانی اس پتھر کے asteroidal parent body کے اندر موجود تھا، سب سے خاص چیز racemization تھی یعنی کہ "D" قسم کے amino acids کو "L" قسم میں تبدیل کرنے کے لئے یا اس کے اُلٹ (vice versa) کرنے کے لئے (یعنی interchange کرنے کے لئے) جو حالات چاہئے تھے وہ سب اس شہابیے کی Parent body میں موجود تھے۔ جیسا کہ ان پتھروں میں Sodium rich alkaline water کی موجودگی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ ان سائنس دانوں نے بتایا کہ سوڈیم (Na) سے بھرپور بہت چھوٹے grains اور nanometer scale کے کیلشیم اور میگنیشیم (Mg, Ca) کے ذرات بھی ہمیں اسی اہم بھید کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ پتھر

بہت Unique ہیں اور یہ اس راز پر سے پردہ اٹھا رہے ہیں کہ قدرتی طور پر دونوں قسم کے amino acids بنتے تھے مگر جب pH اور درجۂ حرارت پانی والے محلول (aqueous solution) میں مناسب ہو جاتا تھا تو دوسرے factors میسّر ہونے کی وجہ سے racemization ہو جاتی تھی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ asteroids میں بہت پانی موجود تھا(یہی بات قرآن کریم بتا چکا ہے کہ Big Bang کے بعد سب سے پہلے پانی ہی بنا (جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت 31 کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔) کیونکہ زندگی بنانے اور اُسے برقرار رکھنے کے لئے پانی ضروری ہے۔) نیز یہ کہ مٹی (تراب) سے جو تحقیق شروع ہوئی اُسکا بھی ذکر قرآن میں موجود تھا اور یہ پتھر (meteorites) بار بار گر کر اسی حقیقت کو عیاں کر رہے ہیں کہ یہ اُس اللہ کے نشانات میں سے ہے کہ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا (الروم آیت 21) پھر قرآن میں ہی یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ پانی والی مٹی (طین) کا بھی تخلیق سے تعلق ہے۔

اس meteorite نے ایک اور راز یہ بھی کھولا کہ chemicals کے Crystals اسی لئے بنے کیونکہ parent body یعنی asteroid میں پانی موجود تھا۔ لوہے کے ان crystals کو magnetite crystals (Fe_3O_2) کہتے ہیں اور ان کی موجودگی سائنس دانوں نے کیلیفورنیا کے Institute of Technology میں Scanning electron microscope (SEC) سے دیکھی۔ اس پتھر میں کاربن بھی کافی مقدار میں ہے اس کے علاوہ hydrogen (H)، silicon (Si)، sodium (Na)، Manganese (Mn) ، لوہا(Fe) اور Oxygen (O) کی بھی وافر مقدار موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں بہت سے Organic Compounds بن رہے تھے نیز hydrocarbons کی بھی تیاری ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس پتھر میں ammonia (NH_3) اور aldehyde نہیں ہے جو کہ Murchison میں بہت تعداد میں تھے اور اسی لئے Murchison میں "L" قسم کے amino acids کی بہتات ہے۔

سائنس دان اس پر بہت خوش ہیں کہ اس پتھر نے ہمیں یہ بتا دیا کہ amino acids کے بننے کے لئے موزوں high pH – environment ہے۔ اور اسی situation کی وجہ سے microbs بنتے ہیں جن میں bacteria اور virus شامل ہیں۔

University of Maryland کی ماہر فلکیات Lucy Me Fadden (astronomer) کا کہنا ہے کہ Tagish meteorite ایک بہت بڑا قیمتی خزانہ ہے[1] جس سے ہم حیران ہوتے ہیں کہ زمین پر زندگی بنانے کے لئے کائنات میں کیسے کام ہو رہا تھا۔ (جاری ہے)

[1] https://www.capecodtimes.com/story/news/2000/10/13/pristine-meteorite-has-clues-to/51017475007/

اے سننے والو سنو!

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

”آجکل کے دنیا کے حالات جو ہیں ان کے بارہ میں اس وقت میں ایک دعا کے لیے بھی کہنا چاہتا ہوں۔...اگر بڑی طاقتیں اپنے دوہرے معیار نہ رکھتیں یا نہ رکھیں تو اس قسم کی بدامنی اور جنگیں دنیا میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ پس ان دوہرے معیاروں کو ختم کرو تو جنگیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ یہی باتیں میں اسلام کی تعلیم کی روشنی میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں لیکن سامنے تو یہ کہتے ہیں ٹھیک ہے لیکن عمل کرنے کو تیار نہیں ہیں۔......

یہ لوگ جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر عمل کرتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں دنیا کی معیشت ہے ان کے آگے ہی انہوں نے جھکنا ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو لگتا ہے کہ بڑی طاقتیں جنگ بھڑکانے پر تُلی ہوئی ہیں بجائے اس کو ٹھنڈا کرنے کے۔ یہ لوگ جنگ ختم کرنا نہیں چاہتے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جنگوں کے خاتمے کے لیے بڑی طاقتوں نے لیگ آف نیشنز بنائی لیکن انصاف کے تقاضے پورے نہ کرنے اور اپنی برتری قائم رکھنے کی وجہ سے یہ ناکام ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم ہوئی اور کہتے ہیں سات کروڑ سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں۔ اب یہی حال یو این (UN) کا ہو رہا ہے۔ بنائی تو اس لیے گئی تھی کہ دنیا میں انصاف قائم کیا جائے گا اور مظلوم کا ساتھ دیا جائے گا۔ جنگوں کے خاتمے کی کوشش کی جائے گی لیکن ان باتوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں۔ اپنے مفادات کو ہی ہر کوئی دیکھ رہا ہے۔

اب جو اس بے انصافی کی وجہ سے جنگ ہو گی اس کے نقصان کا تصور ہی عام آدمی نہیں کر سکتا اور یہ سب بڑی طاقتوں کو پتہ ہے کہ کتنا شدید نقصان ہو گا۔ لیکن پھر بھی انصاف قائم کرنے پر کوئی توجہ نہیں ہے اور توجہ دینے پر کوئی تیار بھی نہیں ہے۔

ایسے حالات میں مسلمان ملکوں کو کم از کم ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ اپنے اختلافات مٹا کر اپنی وحدت کو قائم کرنا چاہیے۔...ایک ہوں گے، وحدت ہو گی تو آواز میں بھی طاقت ہو گی ورنہ معصوم مسلمانوں کی جانوں کے ضائع ہونے کے یہ لوگ ذمہ دار ہوں گے، مسلمان حکومتیں ذمہ دار ہوں گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے اور یہ ان طاقتوں کا کام ہے رکھیں کہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو۔ پس اس اہم بات کو سمجھیں۔...

بہر حال ہمارے پاس تو دعا ہی کا ہتھیار ہے اسے ہر احمدی کو پہلے سے بڑھ کر استعمال کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ بڑی طاقتوں کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ دونوں طرف انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے امن قائم کرنے والی بنیں۔ یہ نہیں کہ ایک طرف جھکاؤ ہو جائے اور دوسری طرف کا حق مارا جائے۔ ظلم و زیادتی میں بڑھنے والی نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ ہم دنیا میں امن و سلامتی دیکھنے والے ہوں۔“

(خطبہ جمعہ فرمودہ 13 اکتوبر 2023ء، روزنامہ الفضل انٹرنیشنل 3 نومبر 2023ء صفحہ 5،6)

Monthly

MUWĀZNA-E-MADHĀHIB

ISSN: 20491131 Editor: Mahfooz ur Rehman

SEPTEMBER 2025 | TABOOK 1404(HS)| RABI UL AWAL 1447(HQ)| VOL.14 NO.09

اگر ہر بال ہو جائے سخن ور تو پھر بھی شکر ہے امکاں سے باہر

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے رسالہ ”موازنہ مذاہب“ کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا:

”ایک (نیا) رسالہ جاری کیا گیا........ تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ ہے ”موازنہ مذاہب“ جو یہاں یوکے سے چھپتا ہے اور اس میں بڑے اچھے علمی اور تحقیقی مضامین ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بڑے پسند آرہے ہیں، اس کی ضرورت تھی اور گو اس وقت اس کی تعداد کم ہے لیکن اس کے بارے میں میں کہنا چاہتا ہوں جو لوگ اردو پڑھنا جانتے ہیں اُن کو اس رسالہ کا خریدار بننا چاہیئے۔ اس میں کافی اچھے مضامین ہیں بلکہ بعض مضامین کے ترجمے کر کے ریویو آف ریلیجنز میں بھی شائع کئے جارہے ہیں۔“

(دوسرے دن کا خطاب، جلسہ سالانہ یوکے 2012ء بحوالہ الفضل انٹرنیشنل مؤرخہ 9 اگست 2013، صفحہ 2)

Publishers: Additional Wakalat Tasneef
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, GU9 9PS, UK
Email: office@tasneef.co.uk
https://www.alislam.org/periodical/muwazna-e-madhahib